تحریکِ نظمِ جماعت

مولانا ابوالکلام آزاد

نذیر سنز پبلشرز ◎ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریکِ نظمِ جماعت

مولانا ابوالکلام آزاد

ابوسلمان شاہجہانپوری

نذیر سنز پبلشرز
۴۰ اے۔ اردو بازار۔ لاہور

نام کتاب .... تحریک تنظیم جماعت

مؤلف .... ابوسلمان شاہجہان پوری

اشاعت اول .... ۲۲ فروری ۱۹۷۷ء

قیمت:- .... پندرہ روپے

*

مطبع

الطاف رحیم پرنٹرز لاہور

فہرست

پیش لفظ

تحریک حزب اللہ، تحریک جہاد، تحریک ہجرت، تحریک نظم جماعت، اور سب سے بڑھ کر تحریک الہلال جواب صحافت، احیائے اسلام، تجدید علوم دین، قیام ملت اور استقلال وطن کی تحریکات کی جامع تھی۔ یہ تمام تحریکات فی الحقیقت ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں یا ایک ہی اصل کے فروع اور ایک ہی نخل تمنا کے برگ و بار تھے۔ مقصود و مطلوب ان سب کا ایک تھا احیائے اسلام اور قیام ملت اسلامیہ۔

حزب اللہ ذہن و فکر کی تربیت گاہ اور مخصوص اصحاب علم و فکر کی مرکزی جمعیت تھی۔ تحریک جہاد و ہجرت حالات و وقت کے پیدا کردہ سیاسی مسائل میں اسلامی جذبات کا مضطربانہ اظہار تھا۔ حزب اللہ ان مسائل میں قوم کی اسلامی رہنمائی سے غفلت نہیں برت سکتی تھی قوم کی رہنمائی کے لئے مولانا آزاد اور ان کے مریدین و مخلصین نے مختلف اوقات اور مختلف دوائر میں جو اقدام کئے وہ تمام ایک ہی سررشتہ نظم و فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن نظم و فکر کے ایک معلوم رشتے کے باوجود حزب، جہاد اور ہجرت کی تحریکات اپنی اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے نظم و خصائص ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں ان میں سے بعض تحریکات خالصاً مولانا آزاد نے پیدا کیں۔ مثلاً تحریک حزب اللہ اس کی تشکیل نظم و ترتیب مقاصد مولانا آزاد کی رہین منت ہے اور اس کی رہنمائی کی باگ ڈور بھی مولانا علیہ الرحمہ ہی کے ہاتھ میں تھی تحریک جہاد کی تاریخ ایک صدی پرانی تھی لیکن ایک خاص دور میں اس کی فکری رہنمائی میں مولانا آزاد بھی شریک ہو گئے تھے بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کچھ مدت تک وہ اس کے واحد رہنما کی حیثیت رکھتے تھے تحریک ہجرت کی رہنمائی بھی فی الحقیقت ایک ہاتھ میں نہ تھی۔ مولانا آزاد کا دست رہنما چند اہم [illegible]

ایک تھا لیکن اس کتاب میں ہمارا موضوع یہ تحریکات نہیں۔ یہاں ہمارا موضوع صرف نظم جماعت کی تحریک ہے اس کے علاوہ اگر کسی تحریک کا تذکرہ آ گیا ہے تو وہ ضمناً اور محض تکمیل بحث کے لئے ہے البتہ ان تمام حضرات کو اس میں شامل کر لیا ہے جنہوں نے مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی خواہ تحریک حزب اللہ کے سلسلے میں ہو، خواہ کسی نے بیعت جہاد کی ہو، خواہ فریضۂ ہجرت کی ادائیگی کے سلسلہ میں نظم و اشتراک اور رشتۂ انسلاک کے قیام کے لئے کی گئی ہو۔

مریدین کے زمرے میں مستقل تذکرہ انہیں حضرات کا کیا ہے جن کے بارے میں بالیقین معلوم ہو گیا کہ انھوں نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی تھی قیاس کو اس معاملے میں دخل نہیں دیا اگر قیاس سے کام لیا جاتا تو کئی اور شخصیتیں اس سلسلے میں شامل کی جا سکتی تھیں مثلاً ڈاکٹر سید عبد الکریم المعروف بہ صدر الدین اس کے سب سے زیادہ مستحق معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مولانا آزاد کے نہایت درجہ اعتماد کے قاصد تھے اور بقول حکیم محمد اسلم سنجری ایلچی یا قاصد اکثر مولانا ابو الکلام آزاد کے مرید یا مولانا عبد القادر قصوری کے مخلص ہوا کرتے تھے اسی طرح ملک محمد اکبر خاں کو مولانا علیہ الرحمہ سے جو عقیدت تھی اور مولانا کے اعتماد و تعلق کا جو اظہار ان کے نام مولانا کے خطوط سے ہوتا ہے اور اقبال شیدائی مرحوم نے اپنی خود نوشت انقلابی کی سرگزشت میں مولانا علیہ الرحمہ سے ان کی ارادت و تعلق کا جو تذکرہ کیا ہے اس سے صاف جھلکتا ہے کہ یہ جوش عقیدت صرف ایک مرید ہی کو اپنے پیر سے اور ایک مسترشد کا اپنے مرشد سے ہو سکتا ہے لیکن اس کیلئے ہمارے پاس ان بزرگوں کا کوئی اعتراف تھا نہ تاریخ کی کوئی شہادت اس لئے ایسے کسی صاحب کا تذکرہ اس کتاب میں نہیں کیا گیا۔

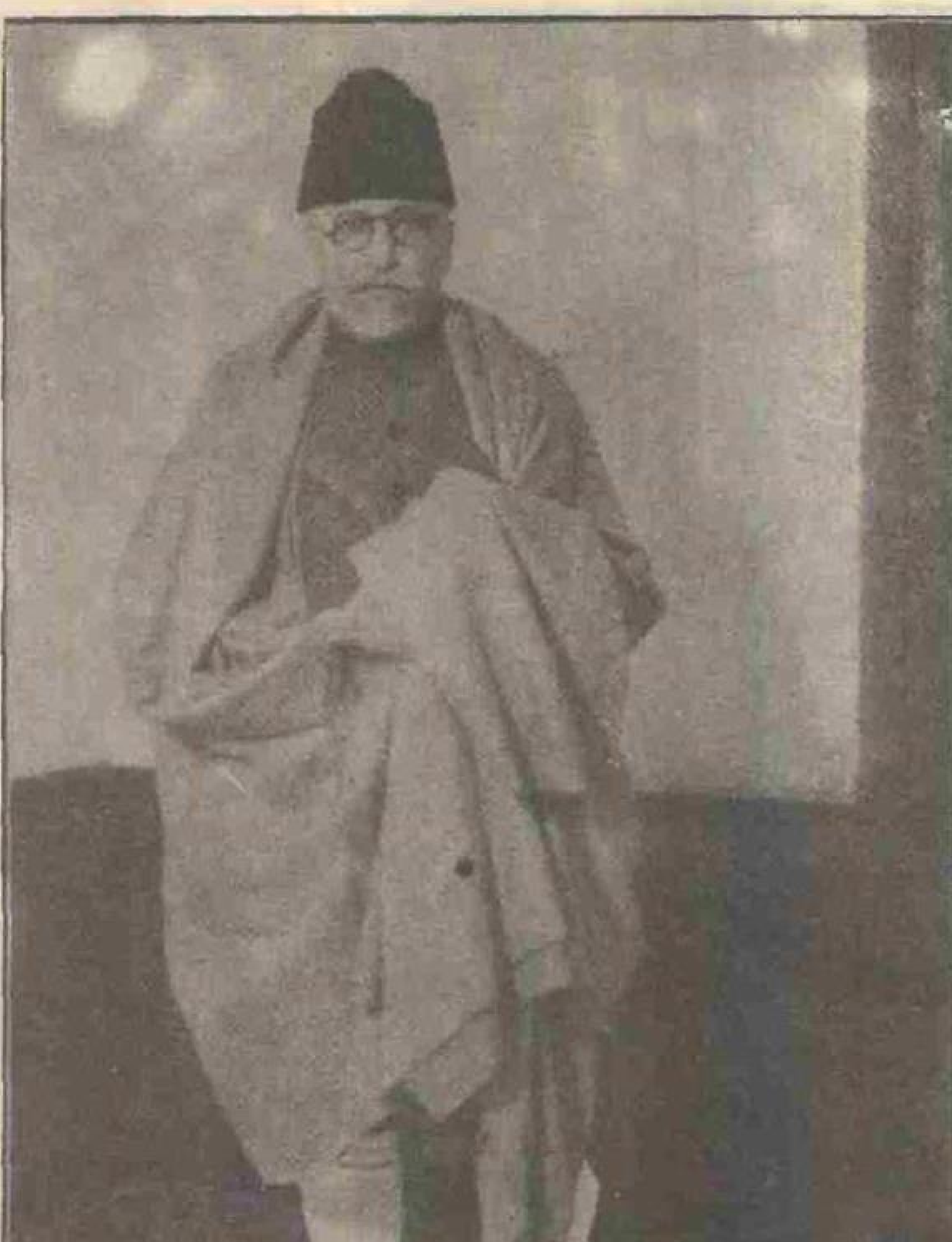
اس کتاب میں جو تراجم آئے ہیں وہ ایک خاص سلسلے میں ایک خاص مقصد کے تحت اور محض تکمیل بحث کے لئے آئے ہیں، تحقیق حالات اور تالیف سوانح مقصد نہیں تھا اگرچہ شاید ہی کوئی ایسی بات ہو جو تحقیق کی کسوٹی پر پوری نہ اترے پھر بھی نظر اسی پر رہنی چاہئے جو ان تراجم کا مقصد ہے یعنی تحریک نظم جماعت، تحریک حزب اللہ وغیرہ سے لوگوں کی دلچسپی، مولانا آزاد علیہ الرحمہ سے لوگوں کی عقیدت و وابستگی اور ملت کے عشق میں اپنی جانیں قربان کر دینے کا جذبہ۔

اس کتاب کی تالیف میں میرا نقطۂ نظر تاریخی رہا ہے اگرچہ اس تحریک سے، اس کے مقاصد سے

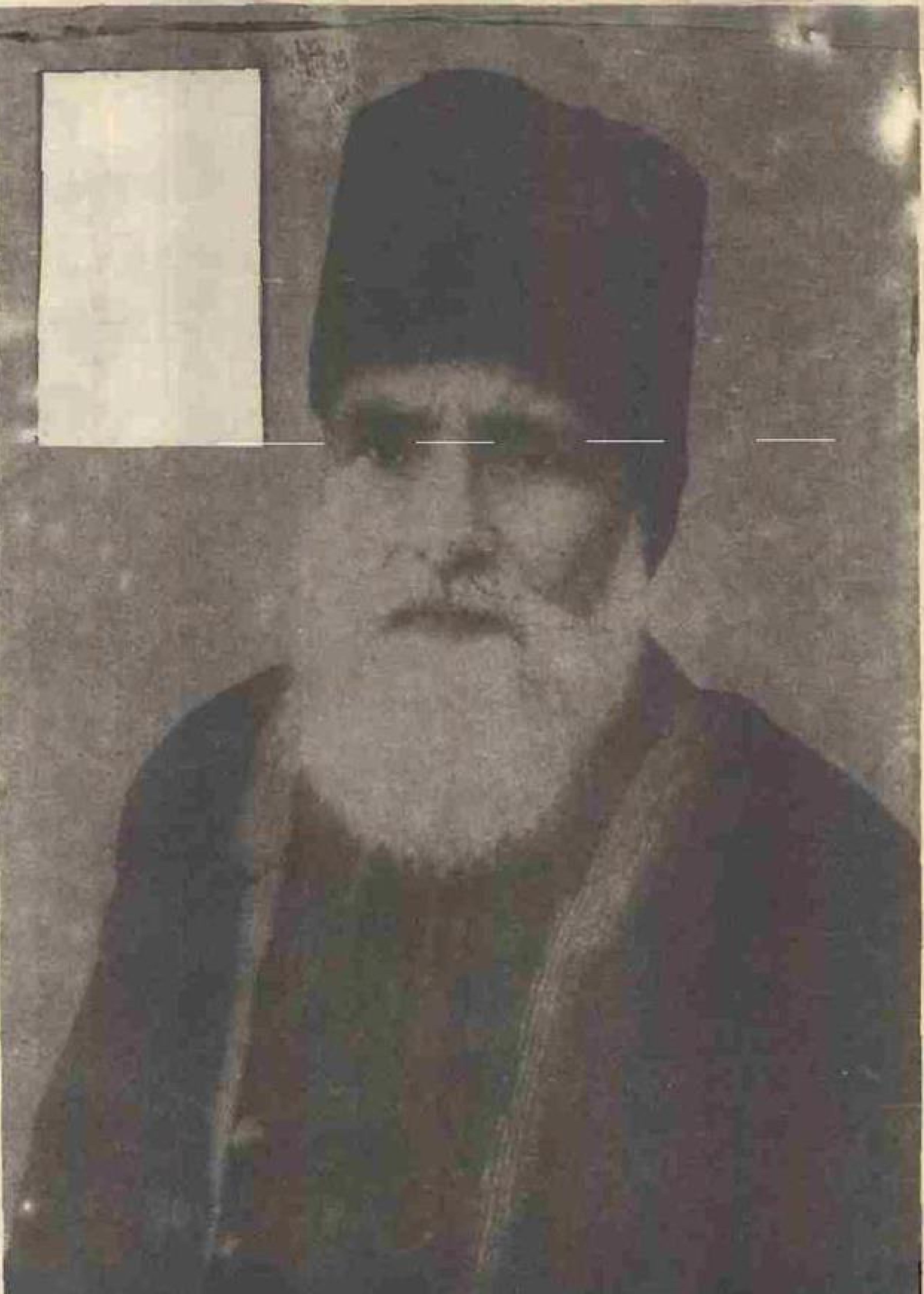
اور اس کی مساعی سے میرا دل متأثر ہے اور اس کی ناکامی کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہے اس وجہ سے ممکن ہے میرا قلم کسی جگہ تاریخی انداز بیان سے ہٹ گیا ہو لیکن اسے کسی شخصیت سے کمال عقیدت اور نہایت ارادت پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔

یہ کتاب "تحریکات ملی" کے سلسلے کی ایک کڑی ہے میں چاہتا ہوں کہ اسی طرح تحریک حزب اللہ تحریک جہاد، تحریک ہجرت، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات وغیرہ پر الگ الگ کتابیں مرتب کر دی جائیں جن میں ہر تحریک کے مقصد، پس منظر، نظام قیادت، انجام، اختتام اور سیاسی و ملی زندگی پر اس کے اثرات کا جائزہ خالص تاریخی نقطۂ نظر سے اور افراد سے عقیدت و ارادت کی سطح سے بلند ہو کر لیا جائے۔

ابتداءً میرے پیش نظر جو مواد تھا اور جن معلومات تک میری نظر پہنچ سکی تھی وہ صرف صوبہ جات یوپی، سندھ، پنجاب اور بہار سے متعلق تھیں اور انہی معلومات کو مرتب کر کے کتابت شروع کرا دی تھی۔ صوبہ سرحد میں حزب اللہ کے قیام، خدمات اور مولانا آزاد کے مریدین و مخلصین کے بارے میں علم بعد میں ہوا۔ اب یہ ممکن نہ تھا کہ یہ نیا مواد کتاب میں جا بجا شامل کیا جاتا اور کتاب کے مباحث اور تحریر میں تبدیلی کی جاتی اس لئے یہ تمام معلومات ایک باب میں مرتب کر کے کتاب کے آخر میں شامل کر دی ہیں۔ ترتیب و تالیف کے نقطۂ نظر سے خواہ اسے کتاب کا نقص سمجھا جائے لیکن معنوی لحاظ سے کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور اس کی افادیت کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔



مولانا ابوالکلام آزاد



مولانا عبدالقادر قصوریؒ



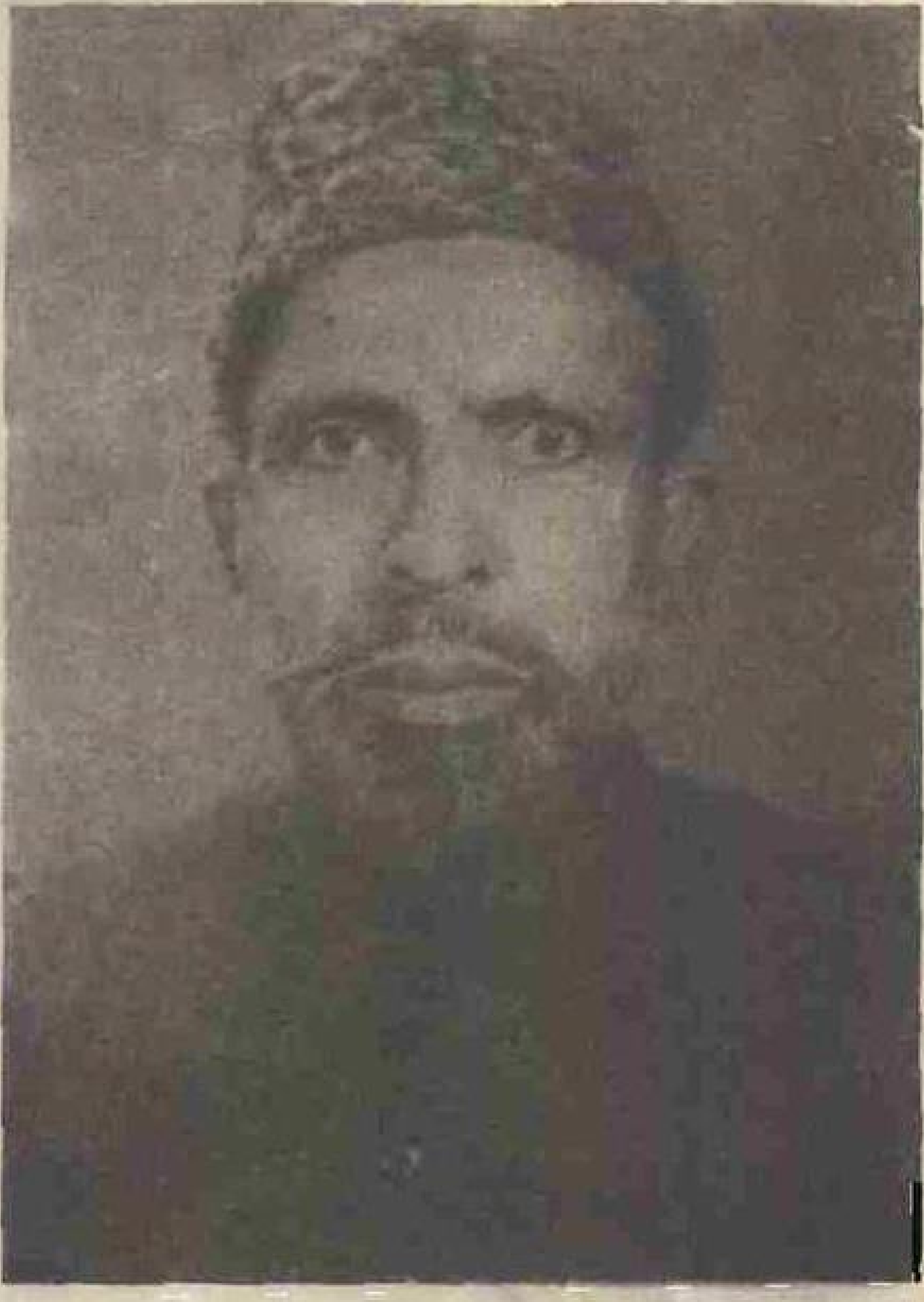
مولانا عبدالرزّاق ملیح آبادی (بیٹھے ہوئے)
مولانا آزاد کے برادر نسبتی بدرالدین کے ساتھ



مولانا سید داؤد غزنوی



مولانا غلام رسول مہر



شیخ قمر الدین



عزیز ہندی



صوفی غلام مصطفےٰ تبسم



حکیم محمد اسلم سنجوی

حصّہ اوّل

تحریکِ نظمِ جماعت

باب اوّل

حقیقت و مقاصد

(۱)

حضرت سید احمد شہید بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید (علیہما الرحمہ) کی تحریکِ جہاد اور اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کی مساعی کی ناکامی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی دعوت قیامِ نظمِ جماعت برصغیرِ ہند پاکستان میں پہلی اسلامی دعوت تھی جو حالات و مصالحہ وقت کی پوری بصیرت کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے ملی مفاد کے تحفظ کے لیے دی گئی تھی جس میں مسلمانوں کے جماعتی مرض کی صحیح تشخیص کی گئی تھی اور اس سے نجات کے لیے صحیح نسخۂ شفا تجویز کیا تھا۔

مسلمانوں کی حالت

مولانا آزاد کی اس دعوت پر نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ اس مدت میں دنیا بھی اور اس برصغیر پاک و ہند میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہو چکے ہیں لیکن ان انقلابات کے باوجود جماعتی زندگی کی وہ اسی مصیبت میں مبتلا ہیں جن سے نجات کے لیے مولانا آزاد نے نظمِ جماعت اور امارتِ شرعیہ کے قیام کا نسخۂ شفا تجویز کیا تھا۔ مولانا آزاد نے جب یہ دعوت دی تو ہندوستان میں مسلمانوں میں نہ کوئی رشتۂ انسلاک تھا، نہ وحدتِ ملت کا کوئی رابطہ تھا، نہ ان کا کوئی قائد اور امیر تھا اور نہ کوئی آمر و نافذ شرع۔ محض ایک بھیڑ تھی، ایک انبوہ تھا، ایک گلہ تھا

جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا تھا اور ایک حیات غیر شرعی و جاہلی تھی، جس میں پوری اقلیم مبتلا تھی، مولانا لکھتے ہیں:

"دس کروڑ مسلمان جو کرۂ ارض میں سب سے بڑی یکجا اسلامی جماعت ہے۔ ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کر رہی ہے کہ نہ تو اس میں کوئی رشتۂ انسلاک ہے نہ وحدتِ ملت کا کوئی رابطہ ہے۔ نہ کوئی قائد و امیر ہے نہ کوئی آمر و نافذ شرع۔ محض ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ ہے، ایک گلہ ہے جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے اور یقیناً ایک حیات غیر شرعی و جاہلی ہے جس میں پوری اقلیم مبتلا ہو گئی ہے۔" [1]

ایک اور جگہ اس حقیقت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

"یہ ساری مصیبت اور نامرادی اس لیے ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی جماعتی نظام موجود نہیں جس کا انتظام شرعاً ان پر واجب تھا اور نہ ہدایت اُمت کے لیے کوئی صاحبِ امر و سلطان و دماغ ہے۔ عہد جاہلیت کی سی ایک طوائف الملوکی اور جماعتی اختلال و برہمی ہے جس میں چھ کروڑ انسان مبتلا ہیں اور جماعتی زندگی کی اس معصیت کی وجہ سے فوز و فلاح سے

---

[1] خطبہ صدارت تحریری، امام الاحرار مولانا ابو الکلام آزاد، سالانہ اجلاس جمعیۃ العلمائے ہند، منعقدہ لاہور ۱۹۲۱ء ص ۳۶۔

تمام دروازے بند ہو گئے ہیں۔ موجودہ حالات میں ان کی جتنی صورتیں شرعاً ہوسکتی ہیں ان سب کے لیے پہلی چیز "جماعت" ہے۔ چونکہ جماعت مفقود ہے اس لیے کوئی راہ نہیں کھلتی اور خود سرگردگان کار حیران ہو کر ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔"[1]

ان حالات میں مولانا آزاد نے نظم جماعت کی ضرورت کو محسوس کیا اور مسلمانوں کو اس کے قیام و اختیار کی دعوت دی۔

نظم جماعت سے مقصود نظم جماعت سے مقصود یہ تھا کہ بر صغیر کے مسلمان نظام شرع کے مطابق ایک صاحب علم و عمل مسلمان امیر اور قائد شرع کی اطاعت پر مجتمع ہو جائیں، وہ ان کا امام ہو، وہ جو تعلیم دے ایمان و صداقت کے ساتھ قبول کریں اور قرآن و سنت کے ماتحت مصالح و مقاصد شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے لیے اس کے جو احکام ہوں ان کی بلا چون و چرا تعمیل و اطاعت کریں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"کامل بارہ سال[2] کے متصل غور و فکر کے بعد اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ بغیر اس کے کبھی عقدہ کار حل نہیں ہو سکتا۔ میرا اشارہ مسئلہ نظام جماعت اور قیام امارت شرعیہ کی جانب ہے۔

---

[1] اعلان، مولانا ابوالکلام آزاد ص ،

[2] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اس مسئلے پر ۱۹۰۹ء سے غور کر رہے تھے۔

مسئلہ نظم جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاحِ حال اور ادائے فرائض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہوسکتی جب تک وہ اپنی موجودہ حیاتِ انفرادی کو ترک کرکے حیاتِ اجتماعی و شرعی اختیار نہ کرلیں یعنی احکام نظامِ شرع کے مطابق سب ایک امیر قائد شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہوجائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہوجائے۔ یہی اصل و اساس کار ہے اور تمام مقاصد اصلاح اور مصالح انقلاب کا نفاذ و ظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف ہے۔"[1]

مسئلے کے مختلف پہلو

مسئلہ نظم جماعت کے کئی پہلو اور اس کی کئی حیثیتیں ہیں:

اولاً: اس کی اسلامی و شرعی حیثیت یعنی مسلمان خواہ کسی ملک کے باشندے ہوں ان کا گرد و پیش ایک دوسرے سے خواہ کتنا ہی مختلف ہو اور ان کی دستوری و سیاسی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو ان کے لیے نظم جماعت کی شرعی حیثیت کیا ہے اور اس کے ترک و اختیار کا شرعی حیثیت سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے کیا تعلق ہے؟

---

[1] خطبۂ صدارت تحریر صفحہ ۴۴

ثانیاً: ہندوستان کے مسلمانوں کے مخصوص حالات اور سیاسی گرد وپیش میں؛ اگر مسلمان بحیثیت ایک مسلم وحدت کے زندہ رہنا اور اپنا اسلامی وملی وجود برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اِس مسئلے کی اہمیت کیا ہے؛

ثالثاً: ہندوستان کے خاص حالات میں اگر مسلمان ایک متحدہ سیاسی قومیت کے اہم عنصر کی حیثیت سے قومی و ملکی فرائض وحقوق کی منزلوں سے گزرنا، سیاسی زندگی کی جد وجہد میں حصّہ لینا، ایک مؤثر سیاسی قوت کی حیثیت میں ہندوستان کے مطلع سیاست پر ابھرنا اور معاشی واقتصادی دوڑ میں حصّہ لینا چاہتے ہیں تو نظم جماعت کا قیام ان کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے؛

رابعاً: اگر ہندوستان کے مسلمان نظم جماعت قائم کر لیتے ہیں تو اُن کا یہ عملِ صالح مسئلہ خلافت اور مسلمان ملکوں کی سیاست میں اور ان کے فرائض کی ادائیگی میں کس درجہ مفید اور انفع ہوگا۔

مولانا نے مسئلے کے ہر پہلو پر اور اس کی اہمیت کے مطابق بحث کی ہے یا کم از کم ضروری اشارات کیے ہیں اور اہل علم و اصحابِ نظر کو توجہ دلائی ہے۔

نظم جماعت کی شرعی حیثیت یہ مسئلہ اپنے تمام پہلوؤں اور اپنی تمام حیثیتوں سے مسلمانوں کے تمام اعمال واقدام کے لیے بمنزلہ اصل واساس کے ہے۔ اسلام اور اسلامی زندگی کی تمام برکات وحسنات نظام جماعت سے وابستہ ہیں اس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی حیاتِ جاہلی و غیر شرعی ہے جسے وہ گزار رہے ہیں۔ مسئلے کی اسلامی و شرعی حیثیت کے

بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

"اسلام نے مسلمانوں کے تمام اعمال حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ کسی حال میں بھی فرادی، متفرق، الگ الگ اور متشتت نہ ہوں ہمیشہ مجتمع، موتلف، متحد اور کنفس واحدہ ہو کر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت میں جا بجا اجتماع ووحدت پر زور دیا گیا ہے اور کفر و شرک کے بعد کسی بد عملی سے بھی اس قدر اصرار و تاکید کے ساتھ نہیں روکا جس قدر تفرقہ وتشتت سے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام واعمال میں یہ حقیقت اجتماعیہ بمنزلہ مرکز ومحور کے قرار پائی اور تمام دائرہ عمل اسی کے گرد قائم کیا گیا۔ عقیدہ توحید سے لے کر تمام عبادات واعمال تک یہی حقیقت مرکزیہ جلوہ طرازی کر رہی ہے اور اسی بناء پر بار بار نظم جماعت پر زور دیا گیا ہے کہ "علیکم بالجماعۃ والسمع والطاعۃ" (رواہ ترمذی) اور "علیکم بالجماعۃ فان الشیطان مع الفذ وھو من الاثنین ابعد" (رواہ البیہقی) اور "اذا کان ثلث فی سفر فلیومروا احدکم" (رواہ اصحاب السنن) اور اسی لیے نظم وقوام ملت کے لیے منصبِ خلافت کو قرار دیا گیا ہے کہ تمام متفرق کڑیاں ایک زنجیر میں منسلک ہو جائیں۔" [1]

---

[1] خطبہ صدارت تحریری ۱۹۲۱ء ص ۵۴

ہندوستان اور مسئلہ نظم جماعت

ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مسئلہ نظامِ جماعت کی اہمیت یہ تھی کہ "ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور ادائے فرائض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہوسکتی جب تک وہ اپنی حیات انفرادی کو ترک کرکے حیات اجتماعی و شرعی اختیار نہ کریں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہوجائے"۔ مولانا کے نزدیک تمام اعمال اصلاحیہ اور تمام مقاصد اصلاح و مصالح انقلاب کا نفاذ و ظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف تھا اس کے بغیر نہ تو احیا و تجدید ملت اور قیام شرع و ادائے فرائض اسلامیہ کی کوئی راہ پیدا ہوسکتی تھی نہ ملکی سیاست اور آزادی کی جد و جہد میں وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکتے تھے اور نہ بحیثیت جماعت کے اپنی ہستی برقرار رکھ سکتے تھے۔

> "مسلمانوں کے لیے راہِ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں جس میں ایک عرصے سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہوگئے ہیں"۔ [1]

نظم جماعت اور فرائض ملی

نظم جماعت کی اہمیت صرف اسی وجہ سے نہ تھی کہ اس کے بغیر

---

[1] مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، البلاغ پریس کلکتہ ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۴۸

مسلمان فرائض شرعیہ اور واجبات دینیہ کی ادائیگی سے قاصر رہتے ہیں بلکہ نظم جماعت کا تعلق ہماری پوری زندگی سے ہوتا ہے اس کے بغیر اپنی دنیاوی زندگی میں بھی ایک قدم نہیں اٹھا سکتے اور کامیابی کا ایک ثمرہ حاصل نہیں کر سکتے۔ دنیا کا کوئی کام ہو کیا اُسے ایک تنظیم اور جماعت کے بغیر انجام دیا جا سکتا ہے۔ انسان کی اجتماعی ترقی، اس کے مفادات کا تحفظ، اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام، قومی اعمال کی انجام دہی غرضیکہ انسانی فلاح و بہبود کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی جماعت کے دستِ کارساز کے بغیر انجام پا سکتا ہے؛ جس زمانے میں مولانا علیہ الرحمہ نے قیام نظم جماعت کی دعوت دی صرف مسلمانوں کے تعلیمی و تہذیبی مسائل ہی نہ تھے بلکہ ہندوستان کی آزادی، منصب خلافت کا تحفظ و صیانت اور جزیرۃ العرب کے تقدس و آزادی کے حفظ و بقا کے عظیم الشان اور بین الملی اور بین الاقوامی اہمیت کے مسائل تھے۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ انھیں بغیر کسی جماعتی قوت و نظم کے حل کر لیا جاتا۔

مولانا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

> "آج وقت کی سب سے بڑی اور ادائے فرض اسلامی کی سب سے نازک اور فیصلہ کن گھڑی ہے جو آزادیٔ ہند اور مسئلہ خلافت کی شکل میں ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں جو اس وقت تک سرشار غفلت تھے اور اب آمادہ ہوتے ہیں کہ اطاعت و اعانت خلیفہ عہد، حفظ و صیانت بلاد اسلامیہ اور آزادی ہندوستان کی راہ میں اپنا اولین فرض اسلام انجام دیں۔

خدارا بتلائیے اس صورتِ حال میں بھی کیا طریقِ کار ہونا چاہیے اور ایسے وقتوں کے لیے آخر اسلام نے بھی کوئی نظامِ کار بتلایا ہے یا نہیں؟ یا وہ باوجود دعویٰ تکمیل شرع اس قدر نامراد ہو گیا ہے کہ آج اس کے پاس وقت کی مشکل و مصیبت کا کوئی حل نہیں؟ اگر بتلایا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا محض انجمن سازی اور ہنگامہ مجالس آرائی؟ کیا محض اتباع ادعی رجال اور تقلید ارباب ظن و تخمین؟ میں اعلان کرتا ہوں کہ اس بارے میں راہ شرعی صرف وہی ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔

جو فتنہ آج یورپ سے اٹھا ہے۔ چھٹی صدی ہجری میں بھی اس کے سیلاب بلاد تاتار و چین سے اٹھے تھے اور تاتاریوں کے استیلأ سے تمام عالم اسلامی تہ و بالا ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی تمام بلاد شرقیہ اسلامیہ کا یہی حال تھا جو آج نظر آ رہا ہے۔ لیکن اس عہد کے علمأ نے پہلا کام یہ کیا کہ جن بلاد پر تاتاریوں کا قبضہ و استیلأ ہو گیا تھا وہاں تنظیم جماعت اور قیام شرع کے لیے ولاۃ مسلمین کے نصب و تقرر کا حکم دیا۔ اسی بناء پر فقہاء متاخرین کے یہاں اس کی تصریح پاتے ہو کہ بلاد محکومۂ کفار میں طلب والی مسلم واجب ہے۔ شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ نے انھیں بلاد محکومہ تاتار کے لیے فتویٰ دیا تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کو ابداً اس کفر پر قانع نہیں ہونا چاہیے اور ایک لمحہ بھی بغیر

کسی امام کے بسر نہیں کرنا چاہیے یا تو وہاں سے ہجرت کر جائیں اور یا ایک امیر نصب کر کے اپنے فرائض شرعیہ انجام دیں۔

فی الحقیقت احکام شرع کی رُو سے مسلمانانِ ہند کے لیے صرف دو ہی راہیں تھیں اور اب بھی دُو ہی راہیں ہیں۔ یا تو ہجرت کر جائیں یا نظام جماعت قائم کر کے ادائے فرضِ ملت کے لیے کوشاں ہوں۔" ؎۱

جماعتی زندگی کی معصیت

جماعتی زندگی کی معصیت سے مولانا کی مراد یہ ہے کہ ان میں ایک جماعت بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"جماعتی زندگی کی معصیت سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک جماعت بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔ وہ بالکل اس گلے کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہے۔ وہ بسا اوقات یکجا اکٹھے ہو کر اپنی جماعتی زندگی کی نمائش کرنی چاہتے ہیں، کمیٹیاں بناتے ہیں، کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اجتماعی نمائشیں شریعت کی نظر میں بھیڑ اور انبوہ کا حکم رکھتی ہیں، جماعت کا حکم نہیں رکھتیں۔

بھیڑ اور جماعت میں فرق

بھیڑ اور جماعت میں فرق ہے۔ پہلی

؎۱ خطبہ صدارت تحریری، ص ۴۳، ۴۴

چیز بازاروں میں نظر آجاتی ہے، جب کوئی تماشا ہو رہا ہو۔
دوسری چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جاسکتی ہے جب
ہزاروں انسانوں کی منظم و مرتب صفیں ایک مقصد، ایک جہت،
ایک حالت، اور ایک ہی (امام) کے پیچھے مجتمع ہوتی ہیں۔"

جماعتی زندگی کا فقدان اور مہالک

"شریعت نے مسلمانوں کے لیے جہاں انفرادی
زندگی کے اعمال مقرر کر دیئے ہیں وہاں اُن کے لیے ایک اجتماعی
نظام بھی قرار دے دیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ زندگی اجتماع کا نام ہے
افراد و اشخاص کوئی شے نہیں۔ جب کوئی قوم اس نظام کو ترک
کر دیتی ہے تو گو اس کے افراد فرداً فرداً کتنے ہی شخصی اعمال و
طاعات میں سرگرم ہوں لیکن یہ سرگرمیاں اس بارے میں کچھ
سُود مند نہیں ہو سکتیں اور قوم جماعتی معصیت میں مبتلا ہو جاتی ہے
قرآن و سنت نے بتلا دیا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی
قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے۔ اشخاص کی معصیت کا زہر
آہستہ آہستہ کام کرتا ہے لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم
(یعنی نظام جماعت کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی
کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔
شخصی اعمال کی اصلاح و درستگی بھی نظام اجتماعی کے قیام
پر موقوف ہے۔ مسلمانان ہند جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہیں

اور جب جماعتی حیثیت سب پر چھا گئی ہے تو افراد کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے۔

جماعتی زندگی کی خصوصیات

کتاب و سنت نے جماعتی زندگی کے تین رُکن بتلائے ہیں:

(الف) تمام لوگ کسی ایک صاحب علم و عمل پر جمع ہو جائیں اور وہ ان کا امام ہو۔

(ب) جو کچھ وہ تعلیم دے ایمان و صداقت کے ساتھ قبول کریں۔

(ج) قرآن و سنت کے ماتحت اس کے جو احکام ہوں ان کی بلا چون و چرا تعمیل و اطاعت کریں سب کی زبانیں گونگی ہوں صرف اسی کی زبان گویا ہو، سب کے دماغ بیکار ہو جائیں، صرف اسی کا دماغ کارفرما ہو، لوگوں کے پاس نہ زبان ہو نہ دماغ۔ صرف دل ہو جو قبول کرے، صرف ہاتھ پاؤں ہوں جو عمل کریں۔

اگر ایسا نہیں ہے تو ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ ہے جانوروں کا ایک جنگل ہے، کنکر پتھر کا ایک ڈھیر ہے مگر نہ تو جماعت، نہ قوم، نہ اجتماع، اینٹیں ہیں مگر دیوار نہیں، کنکر ہیں مگر پہاڑ نہیں، قطرے ہیں مگر دریا نہیں۔ کڑیاں ہیں جو ٹکڑے ٹکڑے کر دی جا سکتی ہیں مگر زنجیر نہیں ہے جو بڑے بڑے جہازوں کو گرفتار کر سکتی ہے۔[1]

---

[1] مسئلۂ خلافت و جزیرۃ العرب ۱۴۸

مولانا کے پیش نظر اس کا سیاسی پہلو بھی تھا اور اس کی اہمیت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ نظم جماعت کے قیام سے غفلت نہ برتی جائے۔ اس بارے میں انھوں نے صاف صاف اپنے علم الیقین کا اعلان کیا کہ راہ شرعی صرف ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آسکے گی ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔

"۱۹۱۴ء کے بیل و نہار قریب الاختتام تھے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ حقیقت اس عاجز پر منکشف کی اور مجھے یقین ہو گیا کہ جب تک یہ عقدہ حل نہ ہوگا ہماری کوئی سعی و جستجو بھی کامیاب نہ ہوگی، چنانچہ اسی وقت سے میں سرگرم سعی و تدبیر ہو گیا۔"

حضرت شیخ الہند سے ملاقات

اسی سلسلہ بیان میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی علیہ الرحمہ سے ملاقات کے بارے میں فرماتے ہیں:

"حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے میری ملاقات بھی دراصل اسی طلب و سعی کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے پہلی ہی صحبت میں کامل اتفاق ظاہر فرمایا تھا اور یہ معاملہ بالکل صاف ہو گیا تھا کہ وہ اس منصب کو قبول کرلیں گے اور ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کر دیا جائے گا مگر افسوس ہے کہ بعض زود دائے اشخاص کے مشورے سے مولانا نے اچانک سفر حجاز کا ارادہ کر دیا اور میری کوئی منت و سماجت بھی انھیں

سفر سے باز نہ رکھ سکی۔

اس کے بعد میں نظر بند کر دیا گیا لیکن ایام نظر بندی میں بھی اس کی فکر و تبلیغ سے غافل نہ تھا۔ چنانچہ صوبہ بہار کے بعض احباب و مخلصین کو اسی زمانے میں اس طرف توجہ دلائی گئی اور وہاں ابتدائی بنیاد اس کی ڈال دی گئی۔ اس زمانے میں میرے عزیز و رفیق مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رانچی میں مجھ سے ملے تھے اور اسی وقت سے سعی و تدبیر میں مشغول ہو گئے تھے۔

جنوری ۱۹۲۰ء میں جب میں رہا ہوا اور موجودہ تحریکِ خلافت کی تنظیم شروع ہوئی تو اس وقت بھی میں نے بار ہا کوششیں کیں اور تمام کارکن جلقے کو اس طرف توجہ دلائی، مگر حالات موافق و مساعد نہ ہوئے اور مجھے مجبوراً انہی اصلاحات پر قناعت کر لینی پڑی جو اس تحریک کے اندر رہ کر میں انجام دے سکتا تھا۔“[1]

خصائص منصب امامت

جس طرح مسئلہ نظم جماعت و امامت چند اصول و مقاصد سے مرکب ہے اسی طرح منصب امامت بھی اپنے لیے چند خصائص و اوصاف کا متقاضی ہے۔ ہر عالم دین اس کا اہل اور ہر مدرسہ نشین اس کا اسرار شناس نہیں ہو سکتا۔

---

[1] خطبہ صدارت تحریری ص ۵۱، ۵۲

مولانا آزاد نے منصب امامت کے خصائص و شرائط پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

"ایک صاحبِ نظرِ اجتہاد دماغ کی ضرورت ہے جس کا قلب کتاب و سنّت کے غوامض سے معمور ہو، وہ اصول شرعیہ کو مسلمانانِ ہند کی موجودہ حالت پر ان کے توطن ہند کی حدیث العہد نوعیت پر، ایک ایک لمحے کے اندر متغیّر ہو جانے والے حوادث جنگ و صلح پر ٹھیک ٹھیک منطبق کرنے اور پھر تمام مصالح و مقاصد شرعیہ وملیہ کے تحفظ و توازن کے بعد فتویٰ شرع صادر کرتا رہے"۔ ؎

ایک اور جگہ اس منصب کے خصائص پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

"آج ایک ایسے عازم امر کی ضرورت ہے جو وقت اور وقت کے سر و سامان کو نہ دیکھے بلکہ وقت اپنے سارے سامانوں کے ساتھ اس کی راہ تک رہا ہو۔ مشکلیں اس کی راہ میں غبار و خاکستر بن کر اڑ جائیں اور دشواریاں اس کے جولان قدم کے نیچے خس و خاشاک بن کر پس جائیں وہ وقت کا مخلوق نہ ہو کر وقت کے حکموں کی چاکری کرے۔ وہ وقت کا خالق و مالک ہو اور زمانہ اس کی جنبشِ لب پر حرکت کرے۔ اگر انسان اس کی طرف سے گردن موڑ لیں تو وہ خدا کے فرشتوں کو بلا لے۔ اگر دنیا اس کا

؎ مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب، البلاغ پریس، کلکتہ، ۱۹۲۰ء، ص ۱۵۰

ساتھ نہ دے تو وہ آسمان کو اپنی رفاقت کے لیے اتار لے
اس کا علم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو اس کا قدم منہاج نبوت پر
استوار ہو۔ اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ حکمت رسالت کے تمام
اسرار و غوامض اور معالجۂ اقوام اور طبابت عہد و ایام کے تمام
سرائر و خفایا اس طرح کھول دے کہ وہ صرف ایک صحیفہ کتاب و
سنّت اپنے ہاتھ میں لے کر دنیا کی ساری مشکلوں کے مقابلے
اور ارواح و قلوب کی ساری بیماریوں کی شفا کا اعلان کر دے۔
وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔" [1]

ایک اور مقام پر مولانا فرماتے ہیں:

"موجودہ وقت کسی ایسے مرد راہ کا طالب ہے جو صاحب
عزم و امر ہو۔ اس لیے نہ ہو کہ دوسروں کی چوکھٹ پر ہدایت و
رہنمائی کے لیے سر جھکائے بلکہ دوسرے اس لیے ہوں کہ رہنمائی
کے لیے اس کا منہ تکیں اور جب وہ قدم اٹھائے تو اس کے
نقشِ قدم کو دلیلِ راہ بنائیں۔ اس کے سلطانِ فکر کی عزیمت
تجویزوں اور بحثوں کی محتاج نہ ہو بلکہ کتاب اللہ کی بصیرت اور
اسوۂ حسنہ نبوت کی حکمت نے اس کو تمام انسانی فکروں اور
رایوں سے بے نیاز کر دیا ہو۔ ان الامانۃ نزلت من السماء

---

[1] خطبہ صدارت تحریری، ص ۵۰، ۵۱

فی جوز قلوب الرجال (رواہ البخاری) اس کا قلب امانت کتاب وسنت کا حاصل ہو اور قلوبھم مصابیح الھدی یخرجون من کل غبراً مظلمۃ (رواہ ابن ماجہ) وہ اپنے اندر مصابیح ہدایت کی ایسی روشنی رکھتا ہو جو باہر کی تمام روشنیوں سے بے پروا کر دے ؎

باغ مرا چہ حاجت سرو وصنوبر است
شمشاد خانہ پرور ما از کہ کمتر است" [1]

قیام نظم جماعت کا تمام تر دار و مدار چونکہ منصب امامت پر تھا۔ یہ منصب اس عمارت کی تعمیر کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر یہ بنیاد درست اور مستحکم نہ ہوتی تو تعمیر کی ساری محنت اکارت جاتی۔ اسی لیے منصب امامت کی تشریح و بیان پر مولانا نے خاص توجہ فرمائی ہے۔ یہاں صرف ایک مختصر اقتباس پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں:

"یہ کام صرف ایک صاحب نظر و اجتہاد کا ہے جس کو قوم نے بالاتفاق تسلیم کر لیا ہو۔ وہ وقت اور حالت پر اصول شریعت کو منطبق کرے گا۔ ایک ایک جزئیہ حوادث و واقعات پر پوری کاروانی اور نکتہ شناسی کے ساتھ نظر ڈالے گا۔ امت و شرع کے اصولی مصالح و فوائد اس کے سامنے ہوں گے۔ کسی ایک

---

[1] اعلان، مولانا آزاد ص ۶

گوشے ہی میں ایسا مستغرق نہ ہو جائے گا کہ باقی تمام گوشوں سے بے پروا ہو جائے۔

حفظت شیئاً و غابت عنك اشیاء!

سب سے بڑھ کر یہ کہ اعمال مہمہ امت کی راہ میں منہاج نبوت پر اس کا قدم استوار ہو گا اور ان ساری باتوں کے علم و بصیرت کے بعد ہر وقت، ہر تغیر، ہر حالت کے لیے احکام شرعیہ کا استنباط کرے گا۔“[1]

---

[1] مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، ص ۱۵۲

باب دوم

حقیقت و مقاصد

(۲)

مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے بھی وقت کے اس اہم اسلامی وملی مسئلے پر مختلف اوقات میں اپنے افکار عالیہ سے مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے ۱۹۱۷ء میں اس وقت اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جب برطانوی مدبر مانٹیگو وزیر ہند اصلاحات کا تہیہ کرکے ہندوستان تشریف فرما ہوئے۔ ان سے علما کے ایک وفد کی ملاقات طے ہوچکی تھی اس سلسلے میں فرنگی محل لکھنؤ میں یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو علما کی ایک مجلس مشاورت منعقد ہوئی۔ حضرت سید صاحب نے اس مجلس میں ایک تحریر پڑھی جو اسی ماہ کے "معارف" اعظم گڑھ میں شائع بھی ہوگئی۔ ؎۱

مسلمانوں کی حالت

سید صاحب مرحوم نے اس تحریر میں ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت انتشار و بے نظمی کا نہایت موثر الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے اور آخر میں اس کا حل بھی

؎۱ سید صاحب مرحوم کی یہ تحریر "مسلمانان ہند کی تنظیم" کے عنوان سے "معارف" اعظم گڑھ بابت ماہ نومبر ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوبارہ اسے "مسلمانان ہند کا نظام شرعی" کے عنوان سے معارف کی اشاعت بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں صفحہ ۴۰۶-۴۱۳ میں نقل کیا گیا۔ میرے پیش نظر یہی اشاعت ثانی ہے۔

پیش کیا ہے لکھتے ہیں:

" ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی امور سخت انتشار اور بے ترتیبی کی حالت میں ہیں مسجدیں ویران ہیں۔ اماموں اور موذنوں کی حالت سخت ناقابل اصلاح ہے۔ مدرسے کسمپرسی میں پڑے ہیں۔ ہندوستان میں جس قدر مذہبی مدارس ہیں ان میں کوئی باہمی نظم وسلسلہ نہیں۔ اوقاف کی حالت سخت قابل افسوس ہے اور روز بروز وہ شخصی تغلب میں آتے جاتے ہیں مسلمانوں کی ابتدائی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ ملک کے بڑے بڑے رقبے مذہبی جہالت کی بنا پر اسلام اور حکومت دونوں کے لیے خطرناک ہیں۔ طلاق ونکاح وفسخ وتفریق کے ہزاروں معاملات جو دن رات پیش آتے ہیں تمام ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ان کا کوئی انتظام نہیں۔ اس کے لیے گورنمنٹ کی سول عدالتوں کو تکلیف گوارا کرنی پڑتی ہے جس میں ایک طرف تو عدالتوں کی اصول اسلامی سے ناواقفیت کی بنا پر نہایت شدید غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، دوسری طرف مسلمانوں کو ان کے مذہبی احکام میں غیر مسلم عدالتوں کی مداخلت سے آزردگی وناگواری پیدا ہوتی ہے اور اکثر علما کے

نزدیک ان معاملات میں غیر مسلم عدالتوں کے فیصلے قبول کرنا ناجائز ہے۔

ادنیٰ اور متوسط مسلمان طبقوں کی اجتماعی حالت ہندوستان میں نظم مذہبی نہ ہونے کے باعث سخت تکلیف میں ہے اور اگر اس دعوے کی مزید شرح کی ضرورت ہو تو دارالمصنفین ندوہ، دیوبند اور دیگر عربی مدارس اور ممتاز علما کے یہاں جا کر روزانہ ڈاک میں استفسار کے خطوط پڑھو۔ اس سال کے اخبارات کی فائل "زوجہ معلقہ" کے مشہور و گرم و تیز مضامین سے مملو ہے۔ اسی طرح مسلمان خواتین کی کثیر تعداد بیکسی میں گرفتار ہے"۔ ؎ۂ

لمحہ فکریہ اس کے بعد سید صاحب علیہ الرحمہ نے علمائے دین، مسلمان سیاسی رہنماؤں اور حکومت کے اربابِ حل و عقد کو اس مسئلے پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے اور بتایا ہے کہ یہ ایسی حالت اور ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

" الغرض ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی حالت ایسی افراتفری اور پراگندگی کی حالت میں ہے کہ

ؔۂ معارف دسمبر ۱۹۱...ء ص ۴۱۰-۱۱

شاید دنیا کے کسی خطے میں جہاں مسلمان آباد ہوں، اس قدر پراگندہ و منتشر نہ ہو گی۔ یہ حالت مسلمانوں اور حکومت دونوں کے لیے قابل غور ہے اور اس لائق ہے کہ ہماری حکومت کے اعلیٰ عہدے دار، ہمارے رہنمایان سیاسی اور ہمارے علمائے دین سب مل کر ان معاملات پر غور کریں اور کوئی مستقل اور پائیدار تدبیر ان کے لیے اختیار کریں۔"[1]

سید صاحب کا کمال بصیرت

واضح رہے کہ علمائے کرام کی یہ مجلس مشاورت جس میں سید صاحب مرحوم نے یہ تجویز پیش کی تھی مانٹیگو سے ملاقاتی وفد کی رہنمائی اور علما کی جانب سے مطالبات کے لیے ترتیب دی گئی تھی۔ اس لیے ٹھیک وہی بات جو مولانا ابوالکلام آزاد مسلمانوں کے ایک آزاد اور مستقل نظام کی حیثیت سے پیش کر رہے تھے اور اس کے لیے کام ایک مدت سے شروع ہو چکا تھا، حکومت کے سامنے علما کے مطالبے کی حیثیت سے رکھنے کی تجویز پیش کر دی۔ ہمیں یقین ہے کہ سید صاحب اس تجویز کے انجام سے بے خبر نہ ہوں گے۔ وہ جانتے ہوں گے کہ حکومت اس درد سری کو کبھی مول نہ لے گی۔ اگر حکومت اس تجویز کو منظور کر لیتی تو ظاہر ہے کہ اس کی مقرر کردہ اور تنخواہ دار شیخ الاسلامی سے وہ ملی مقاصد پورے نہیں ہو سکتے تھے جو مولانا آزاد کے پیش نظر تھے۔ اس سے مسلمانوں کے پیروں میں ایک بیڑی کا اضافہ اور ہو جاتا لیکن

---

[1] معارف دسمبر ۱۹۲۹ء، ص ۴۱۱

ہمیں اس وقت کے ان حالات کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے کہ اس وقت ملک کے تمام اکابر علماء ملک میں اور بیرونِ ملک قید و نظر بند تھے ان حالات میں تحریک کا زندہ رکھنا بھی ایک بڑا کام تھا۔ یہ بات سید صاحب کے کمالِ بصیرت کی دلیل ہے۔ سیّد صاحب نے جس شکل میں اور جس مقدمے کے ساتھ اس تجویز کو رکھا اس میں آئندہ اس تحریک کو حکومت کی نظرِ عتاب سے محفوظ رکھنے کا پورا سر و سامان موجود تھا۔ اس کے بعد اگر یہ تحریک پورے زور و شور سے آگے بڑھتی اور حکومت کو اس کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے تو سیّد صاحب کی اس تجویز میں اس کا پورا علاج موجود تھا لیکن جیسا کہ خیال تھا یہ تجویز لائق اعتنا نہیں سمجھی گئی۔

صیغۂ مذہبی کا قیام سید صاحب مرحوم نے وقت کے اس اہم ترین ملی مسئلے کو حکومت کے اربابِ حل و عقد اور مسلمانوں کے اصحابِ نظر و تدبّر، دونوں فریقوں کے سامنے صرف پیش کر دینے اور اس کی اہمیت واضح کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے حل کی طرف بھی ان کی رہنمائی کی۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

"ہمارے نزدیک بہترین تدبیر یہ ہے کہ اسلام کی گزشتہ روایات اور موجودہ رسوم جاریہ کے مطابق مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی صیغہ ہندوستان میں قائم کیا جائے جس کا اعلیٰ عہدے دار شیخ الاسلام ہو جس کی عزت و

وقار کا سرکاری طور پر اعتراف کیا جائے۔ اس کے بعد ایک بڑی تنخواہ دے کر اس کے اعزاز کو بڑھایا جائے اس کا تقرر مسلمان جماعتوں کے انتخاب اور گورنمنٹ کی منظوری سے ہو۔ اس کے ماتحت صوبوں میں اور صوبوں کے ماتحت ضلعوں میں اس کے عہدے دار ہوں جو اپنے حدود کے انتظامات کریں۔ اس صیغے کے ماتحت حسب ذیل چیزیں ہوں۔

- احکام و مسائل شرعی کا اجرا و نفاذ
- منازعات مذہبی کا فیصلہ
- اوقاف، مساجد، اور مدارس کا انتظام
- دارالافتاء کا قیام

یہ تمام صیغے واقف قانون، ذی فہم اور روشن خیال علما کے ماتحت ہوں۔ جن کو مخصوص نصاب تعلیم کے مطابق پڑھایا جائے ورنہ ڈر ہے کہ مسلمانوں کے پاؤں میں ایک نئی آہنی بیڑی پڑ جائے گی۔" [لہ]

مطالبے کا جواز

سید صاحب مرحوم نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر مطالبے کا جواز اور اس کے لیے نظائر بھی فراہم کر دیے۔ فرماتے ہیں:

"ہم مسلمان اس (حکومت برطانیہ) سے ایک ایسی چیز

[لہ] معارف دسمبر ۱۹۲۹ء، ص ۴۱۲۔

کے خواہش مند ہیں جس کے ہم جائز حقدار ہیں۔

۱۔ ہماری قوم میں مذہباً اور قانوناً جب تک ہم دنیا کے فرمانروا رہے، یہ عہدہ قائم رہا۔

۲۔ ہندوستان کے گزشتہ عہد میں بھی یہ صیغہ قائم تھا۔

۳۔ تمام بلاد اسلامیہ میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں اور جن میں سے اکثر یورپین طاقتوں کے ماتحت ہیں اور امریکہ کے ماتحت بھی کچھ حصے ہیں۔ وہاں یہ صیغہ خود سرکاری امداد و اعانت سے موجود ہے۔

۴۔ خود ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں بھی اس قسم کے انتظامات جاری ہیں۔

۵۔ حکومت برطانیہ کے آغاز عہد میں اس قسم کے انتظامات ملک میں رائج تھے لیکن رفتہ رفتہ مٹ گئے۔" لہ

مولانا آزاد اور اسوۂ یوسفی

۱۹۱۹ء کے شروع میں سید صاحب علیہ الرحمہ نے معارف میں ایک سلسلہ مضمون "نظر بندان اسلام" کے عنوان سے شائع کیا اس میں مولانا آزاد کی دعوت تنظیم جماعت کی طرف نہایت لطیف پیرایۂ بیان میں اشارہ کیا ہے۔ "مولانا ابوالکلام آزاد" کی سرخی کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"اگر ہمارے نظر بندوں میں کوئی ایسا ہے جو اسوۂ محمدیؐ پر فائز ہوا لہ

لہ معارف دسمبر ۱۹۲۹ء، ص ۴۱۲۔ ۵۲ اشارہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی طرف ہے جو اس زمانے میں جزیرہ مالٹا میں قید تھے۔

تو ہم میں ایک اور ہستی ایسی ہے جو اسوۂ یوسفی کے درجے پر ممتاز ہوئی اور جو زنداں میں بھی جاکر زمزمہ سنج "یاصاحبی السجن ءَاربابٌ متفرقون خیرٌ ام اللہ الواحد القہار" ہے۔" [۱]

اس مضمون کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے۔

"ان سطروں کے لکھنے وقت مجھ کو یہ دھوکا ہو رہا ہے کہ کیا میں خود ابن تیمیہ اور ابن قیم یا شمس الائمہ سرخسی اور امیر بن عبدالعزیز اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں" [۲]

میرا خیال ہے کہ ۱۹۱۹ء میں صیغۂ مذہبی کے قیام کے مطالبے کی نامنظوری کے بعد سید صاحب نے سمجھ لیا ہوگا کہ حکومت اس مطالبے کو کبھی منظور نہیں کر سکتی۔ اس لیے اس کے بعد سید صاحب نے اس امر کی کبھی کوشش نہیں کی کہ حکومت سے اس مطالبے کو منظور کرایا جائے بلکہ اس کے بعد کی ان کی تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی دل و جان سے آزاد اور مستقل نظم ملت کے قیام کے متمنی تھے۔

ملت اسلامیہ کی غمخواری

۱۹۲۵ء میں سید صاحب نے ایک نہایت مفصل اور پر زور مضمون "عالم اسلامی کی تنظیم اور مسلمانوں کا انتشار خیال" کے عنوان سے لکھا جو معارف اعظم گڑھ کی اگست (صفحہ ۹۷ - ۸۸) اور ستمبر (صفحہ ۷۶ - ۲۶۶) کی دو اشاعتوں میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی تیسری قسط "نظم ملت" کے

---

[۱] معارف اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۱۹ء ص ۲۵۷

[۲] " " " ص ۲۵۹

عنوان سے خاص مسلمانان ہند کی مذہبی تنظیم کے متعلق ہے۔ اس میں حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے دل کے ٹکڑے صفحۂ کاغذ پر پھیلا دیے ہیں۔ اس تحریر کا ایک ایک لفظ سوزدلی اور ملت اسلامیہ کے غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس مضمون میں سید صاحب نے نہایت تفصیل کے ساتھ "نظم جماعت" کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور دلائل شرعیہ سے اس نظام کو مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی اسلامی ضرورت ثابت کیا ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کے دور انحطاط میں جب کہ مسلمانوں کی حکومتیں مٹنے لگیں تھیں، اس نظام کی موجودگی پر روشنی ڈالی ہے اور جس طرح ماضی میں اس نظام کی موجودگی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور حال میں اس کی ضرورت کو واضح کیا ہے اسی طرح مسلمانوں کے لیے مستقبل میں اس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

حیات ملی کی بنیاد

حضرت سید صاحب نے مسلمانوں کی تنظیم اور شیرازہ بندی کو ان کے زندہ رہنے کے لیے ایک ضرورت اور قیام ملت اسلامیہ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اگر ہم مسلمانوں کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے ہیں اور یقیناً مسلمانوں کو زندہ رہنے کے لیے اس تنظیم کی حاجت ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بغیر اس کے ہیئت اسلامیہ کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ آج ہمارے سینکڑوں کام ہیں، ہر کام کے لیے ایک ایک عالم گیر مجلس یا انجمن ہم نے قائم کی ہے قوم پر اثر رکھنے کے لیے تاکہ ان کے کاموں کے لیے

ان کو روپیہ ملتا رہے آج ہر شہر میں ہر [illegible] انجمن دوسری مجلس اور انجمن سے ٹکرا رہی ہے۔ ہمارے کام کی انتہا گداگری ہوتی ہے اور کم از کم دو تین نسلیں اینٹ اور چونے کی عمارت اور فراہمی سرمایہ میں کھپ جاتی ہے اور کارکنوں کو اصلی کام کا موقع یا تو ملتا ہی نہیں یا کم ملتا ہے اور یہ ہماری تباہی کے اسباب ہیں۔ ان سب کا علاج یہ ہے کہ ہماری ہیئت اجتماعی یا جماعت بندی پوری طرح کی جائے اس کے بغیر ہم صرف منتشر اور بکھرے افراد ہیں جماعت نہیں اور اس لیے ہم اس حالت میں کسی جماعت اور کسی قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے یا مختلف مجلسوں اور انجمنوں میں بٹے ہوئے مختلف ٹولیاں ہیں جو خود باہم ہاتھا پائی میں مصروف ہیں۔ مختلف خانوادوں اور پیروں کے مرید ہیں جو الگ الگ حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔"

مستقبل کی ضرورت مسلمانان ہند کے مستقبل کے لیے "نظم جماعت" کی اہمیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

"یہ کوئی چھپا راز نہیں کہ آئندہ ہندوستان کی حکومت کی کوئی سی بھی شکل ہو وہ خواہ ایک آزاد حکومت زیر سایہ برطانیہ ہو یا بڑھ کر ایک آزاد جمہوریہ بن جائے تاہم وہ

کوئی اسلامی حکومت نہ ہو گی۔ اور اس کی ملکی تنظیم مسلمانوں کی ملی تنظیم کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ اس لیے یہ حلقہ درجہ غور کے قابل حقیقت ہے۔"

نظم جماعت اور مسلمانوں کی آئندہ بقا

مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کے خطبۂ صدارت میں نہایت تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کی ملی زندگی کے انتشار، ان کی معاشرتی زندگی کے الجھاؤ اور ان کی اقتصادی و تعلیمی مشکلات کو بیان کیا ہے۔ نظم ملت کی ضرورت اس کے شرعی احکام، منصب امامت کے خصائص اور شرائط امامت پر روشنی ڈالی ہے نیز علمائے کرام اور جمعیت علمائے ہند کو نظم ملت کے فریضے کی جانب توجہ دلائی ہے۔

اگرچہ سید صاحب مرحوم کا یہ پورا خطبہ نہایت فکر انگیز ہے لیکن یہاں پر صرف ایک جامع اقتباس پر اکتفا کر رہا ہوں حضرت سید صاحب فرماتے ہیں:

"ہندوستان میں اب اور اب سے زیادہ آئندہ مسلمانوں کی دینی بقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک امارت شرعی کے ماتحت اپنے کو منظم کریں۔ تعلیم یافتہ حضرات کو شبہ ہے کہ علما اس پردے میں اپنی کھوئی ہوئی وجاہت کو دوبارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ بات صاف کر دینا چاہیے

کہ اگر ترکی میں مصطفیٰ کمال، مصر میں سلطان فواد، عرب میں ابن سعود ریف میں محمد بن عبدالکریم ریاست اسلامی کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور ہم لوگ اس کے قبول کرنے کو تیار ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندوستان میں ایک غیر مسلح، اہل اور صاحب لیاقت قائد کے ہاتھ پر بیعت نہ کر سکیں۔

اس کے لیے باقاعدہ بوریا نشیں عالم ہونے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس کے دل کو اسلام سے آشنا ہونے کی حاجت ہے۔ اس کے لیے اپنے مذہب اور مذہبی احکام سے ایک حد تک واقف ہونے کی ضرورت ہے اس قائد کے ماتحت ایک منتخب مجلس شوریٰ ہو اس کے ماتحت تعلیم و تبلیغ، تالیف و اشاعت، سیاست و اصلاحات، غیر ملکی تعلقات، مالیات کے مختلف شعبے ہوں، ہر ایک شعبے کا ایک علیحدہ مدیر و ناظم ہو۔ تمامی محاصل و زکوٰۃ ایک جگہ جمع ہو کر ضروریات میں تقسیم ہوں۔ اسی اصول پر صوبوں کی امارتیں اور ان کے ماتحت اضلاع کی وعلیٰ ہذالقیاس اس کے ماتحت نکاح و طلاق و وراثت وغیرہ کے محکمے ہوں، دارالافتاء ہوں جہاں سے جدید ضروریات کے متعلق فتوے صادر ہوں اور سارے ملک میں اس مسئلے میں جو بے ترتیبی ہے وہ دور ہو۔

چند سال پہلے اس کے لیے موسم مناسب تھا۔ محض اس لیے بعض اکابر نے اس سے پہلو تہی کی کہ تمام مسلمان اس پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اس لیے جب تک اتفاق عام نہ ہو جائے اس کو قائم نہ کیا جائے[۱] میری رائے میں حد درجہ غلطی ہے۔ یہ ناممکن ہے کسی طاقت کے بغیر تمام مسلمان ازخود ایک مرکز پر متفق ہو جائیں اس لیے اس خیال خام سے ہٹ کر ہم کو صرف یہ کرنا چاہیے کہ صوبوں میں اس کے متعلق کوشش کریں۔ جن صوبوں میں مسلمان بالکل صفر ہیں جیسے مدراس، ممالک متوسطہ وغیرہ، وہاں اس کی سب سے پہلے ضرورت ہے۔ اور جس قدر مسلمان بھی اس مسئلے پر متفق ہو سکیں اور اس تحریک پر آمادہ ہو سکیں۔ ان کو ساتھ لے کر آگے بڑھنا چاہیے آئندہ اس سلسلے کی خود وسعت ہوتی رہے گی۔ تا آنکہ کسی وقت تمام مسلمان اس حلقے میں آ جائیں۔"[۲]

نظم ملت کا مقصد جمعیت علمائے ہند کے اجلاس کلکتہ کے اس خطبۂ صدارت میں "نظم ملت" کے مقصد کی ان الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں:

۱۔ سنہ ۱۹۲۰ء، سنہ ۱۹۲۱ء کے حالات اور علمائے فرنگی محل کی اس مسئلے میں اپنی آن کی طرف اشارہ ہے۔ ۲۔ جمعیۃ العلماء کا خطبۂ صدارت، معارف، مارچ ۱۹۲۱ء، ص ۲۰۰۔

"اس قسم کے نظم ملت سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کی وحدت ملی نمایاں ہو، ان کے تمام مذہبی و ملی کام منظم ہوں، ان کی ضرورتیں پوری ہوں، ان کے مصارف و مداخل میں ایک تنظیم پیدا ہو اور اصلی جماعتی روح ان میں نمایاں ہو۔ دار الافتا، دار القضاۃ اور بیت المال کا قیام ہو، ان کے غریبوں اور محتاجوں کی باقاعدہ امداد ہو، ان کی معاشرتی خرابیوں کی باقاعدہ اصلاح ہو، تبلیغ و احتساب کا سلسلہ قائم ہو، ان کے مکاتب و مدارس مالی نزاع سے نجات پائیں۔"[۱]

۱۹۲۶ء میں مجلس العلما مدراس کے خطبۂ صدارت میں بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور نظم ملت کے مقصد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"تنظیم سے مقصود یہ ہے کہ ہر صوبے کے اندر اور پھر اس کے ذریعے سے تمام ملک کے مسلمان کسی ایک نظام کے ماتحت اس طرح متحد ہو جائیں کہ زنجیر کے ایک سرے کو ہلانے سے زنجیر کی ہر کڑی اپنی جگہ پر ہل جائے۔"[۲]

اس سلسلے میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں:-

"ان تمام لوگوں کو جو مسلمانوں کا اجتماعی وجود چاہتے ہیں، جو ان کے جماعتی کاروبار کو چلانا چاہتے ہیں، سب

۱؎ جمعیۃ العلما کا خطبہ صدارت، معارف، مارچ ۱۹۲۶ء، ص ۱۷۳

۲؎ مجلس العلما مدراس کا خطبۂ صدارت، معارف اپریل ۱۹۲۶ء ص ۲۶۲

سے پہلے خود مسلمانوں کو فرقوں کے بجائے جماعت بنانے
کی کوشش کرنی چاہیے اور اسی کا نام "نظم ملت" ہے"۔[۵۱]

دلائل شرعیہ شرعی نقطہ نظر سے حضرت سید صاحب کے نزدیک نظم جماعت کے مسئلے کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بغیر ہندوستان کے مسلمان اس وقت بھی اور آج بھی صحیح اسلامی زندگی سے محروم اور دور ہیں۔ حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ نے اس ایک جملے میں جو کچھ بیان فرمادیا اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے کہ اس کی اہمیت کی وضاحت میں بیان کیا جائے:

"اسلام کے عقیدے میں نظم جماعت کے بغیر ہم صحیح اسلامی زندگی پر یقیناً قائم نہیں ہیں۔ نصب الامامۃ واجبۃ"[۵۲]

حضرت سید صاحب مسلمانوں کے تمام کاموں کی درستگی کے لیے نصب امامت اور قیام جماعت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے تمام قومی اور اجتماعی کام اسی وقت جائز ہیں جب پہلے ان کی جماعت کا کوئی امام ہو۔ اس لیے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا سب سے پہلا کام یہی ہے کہ وہ امام کے نصب و قیام کے بعد ایک قوم بن جائیں۔ اگر امامت نہ ہوگی تو جماعت بھی نہ ہوگی اور جب جماعت نہ ہوگی تو ان کا کوئی کام بھی درست نہ ہوگا"۔[۵۳]

---

۵۱ نظم ملت، معارف، نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۳۳۵۔ ۵۲ جمعیۃ العلما کا خطبۂ صدارت معارف مارچ ۱۹۲۶ء ص ۱۷۰۔ ۵۳ نظم ملت، معارف، نومبر ۱۹۲۵ء ص ۳۳۵

سے پہلے خود مسلمانوں کو فرقوں کے بجائے جماعت بنانے
کی کوشش کرنی چاہیے اور اسی کا نام "نظم ملت" ہے"۔[۵۱]

دلائل شرعیہ شرعی نقطہ نظر سے حضرت سید صاحب کے نزدیک نظم جماعت کے مسئلے کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بغیر ہندوستان کے مسلمان اس وقت بھی اور آج بھی صحیح اسلامی زندگی سے محروم اور دور ہیں۔ حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ نے اس ایک جملے میں جو کچھ بیان فرمادیا اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے کہ اس کی اہمیت کی وضاحت میں بیان کیا جائے:

"اسلام کے عقیدے میں نظم جماعت کے بغیر ہم صحیح اسلامی زندگی پر یقیناً قائم نہیں ہیں۔ نصب الامامۃ واجبۃ"[۵۲]

حضرت سید صاحب مسلمانوں کے تمام کاموں کی درستگی کے لیے نصب امامت اور قیام جماعت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے تمام قومی اور اجتماعی کام اسی وقت جائز ہیں جب پہلے ان کی جماعت کا کوئی امام ہو۔ اس لیے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا سب سے پہلا کام یہی ہے کہ وہ امام کے نصب و قیام کے بعد ایک قوم بن جائیں۔ اگر امامت نہ ہوگی تو جماعت بھی نہ ہوگی اور جب جماعت نہ ہوگی تو ان کا کوئی کام بھی درست نہ ہوگا"۔[۵۳]

---

۵۱ نظم ملت، معارف، نومبر ۱۹۲۵ء، ص ۳۲۵ - ۵۲ جمعیۃ العلما کا خطبۂ صدارت معارف مارچ ۱۹۲۶ء ص ۱۷۰ - ۵۳ نظم ملت، معارف، نومبر ۱۹۲۵ء ص ۳۲۵

مجلس شوریٰ

اس مقام پر سید صاحب علیہ الرحمہ نے امام کے نصب و قیام کے سلسلے میں بعض اعتراضات کا بھی جواب دے دیا ہے اس کے بعد منصب امامت کے ساتھ قیام شوریٰ کو بھی وہ لازم قرار دیتے ہیں۔ شوریٰ کا تعلق مسلمانوں کی حیات شرعی واجتماعی کے خصائص میں سے ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

"اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کی تنظیم کا اصلی شیرازہ ان کی جماعت ہے اور اس جماعت کا مرکز ایک واجب الاطاعت شخصیت اور اس کے ساتھ بحکم وامرھم شوریٰ بینہم (مسلمانوں کے کام یا حکومت یا آپس کے مشورے سے ہیں) اولوالامر اور ارکان شوریٰ کا وجود ہے کہ خود امام اولین و آخرین کو بھی بارگاہ الٰہی سے یہی حکم تھا۔

شاورھم فی الامر اور اے رسول یا اے مسلمانوں کے امام ان مسلمانوں سے باہم مشورہ کر لیا کرو

اس تنظم و جماعت کے تحت ہمارے تمام کام کسی نزع، کسی تصادم اور کسی باہمی جھگڑے کے بغیر انجام پا سکتے ہیں۔۔۔۔ یہ چیز پوری طرح کامل اہمیت کے ساتھ اور پورے نظام کے ساتھ قائم ہو جائے تو مسلمان حقیقت میں مسلمان ہو جائیں۔" [۵]

---

[۵] نظم ملت معارف اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۲۵ء ص ۳۳۶

باب سوم

تاریخ و تحریک

نظمِ جماعت کے قیام کی کوشش

اس مقصد کے حصول کے لیے ۱۹۱۴ء میں مولانا بعض علما سے خود ملے اور بعض کے پاس مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کو بھیجا لیکن علمائے وقت نے عام طور پر اس مسئلے کی اہمیت کو نہیں سمجھا اور اعراض و انکار سے کام لیا۔ البتہ جب مولانا آزاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے ملاقی ہوئے اور انھیں عزائم و مقاصد کی طرف توجہ دلائی تو حضرت مرحوم نے پہلی ہی صحبت میں اس سے کامل اتفاق ظاہر فرمایا۔ ترجمان القرآن میں سورۂ توبہ کی ایک آیت پر نوٹ میں فرماتے ہیں:

"۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا۔ ہندوستان کے علما و مشائخ کو عزائم و مقاصد وقت پر توجہ دلاؤں، ممکن ہے چند اصحاب رشد و عمل نکل آئیں۔ چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی لیکن ایک شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے

[illegible] مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسن دیوبندی

کی تھی جو اب رحمت الٰہی کے جوار میں پہنچ چکی ہے"۔ ؎۱

مولانا محی الدین قصوری کے نام ایک خط میں بھی مولانا نے اپنی ان کوششوں، علما سے اپنی ملاقاتوں اور ان کے مایوس کن جواب کی طرف اشارہ فرمایا ہے لکھتے ہیں:

"۱۹۱۴ء میں جب میں نے ہندوستان کے بعض اکابر علماؔ مشائخ کو عزم وسعی کی دعوت دی۔ بعض سے خود ملا اور بعض کے پاس مولوی عبیداللہ سندھی کو بھیجا تو اکثر نے بعینہٖ یہی بات کہی تھی جو آپ کہہ رہے ہیں۔ بعض علما و مشائخ کی اتنی بڑی تعداد ملک میں موجود ہے کسی نے بھی آج تک یہ دعوت نہیں دی اب سواد اعظم کے خلاف یہ قدم کیوں اٹھایا جا رہا ہے"۔ ؎۲

حضرت شیخ الہند مولانا آزاد کے نزدیک حضرت شیخ الہند کی مستثنیٰ شخصیت کے سوا ہندوستان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اس مسئلے کی اہمیت وحقیقت اور منصب امامت کے فرائض ومہمات اور پھر موقتہ حالات کی بنا پر مشکلات وصعوبات راہ کا نکتہ شناس ہو۔ علمائے متاخرین میں حضرت شیخ الہند کی دعوت وعزیمت کا مولانا آزاد نے نہایت شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ ابھی چند

؎۱ ترجمان القرآن جلد دوم۔ مکتبہ مصطفائی لاہور، ص ۹۵

؎۲ تبرکات آزاد، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر۔ لاہور ۱۹۵۹ء، ص ۴۷، ۴۸

سطریں پہلے منصب امامت کے خصائص و شرائط کا تذکرہ آیا تھا چونکہ اس منصب کے لیے مولانا آزاد کی نظر انتخاب حضرت شیخ الہند پر پڑی تھی اس لیے نامناسب نہ ہوگا کہ ان کی سیرت کے خصائص و کمالات پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ نظر و مطالعے کی اس ضرورت کے لیے مولانا آزاد ہی کا بیان کفالت کرتا ہے:

"مولانا مرحوم ہندوستان کے گذشتہ دور کے علما کی آخری یادگار تھے۔ ان کی زندگی اس دور حرمان و فقدان میں علمائے حق کے اوصاف و خصائل کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمال حقہ میں بسر ہوا۔ وہ علمائے ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ستر برس کی عمر میں جب ان کا قد ان کے دل کی طرح اللہ کے آگے جھک چکا تھا عین جوار حرم میں گرفتار کیے گئے اور کامل تین سال تک جزیرہ مالٹا میں نظر بند رہے یہ مصیبت انھیں صرف اس لیے برداشت کرنی پڑی کہ اسلام و ملت اسلام کی تباہی و بربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کر سکا اور انھوں نے اعدائے حق کی مرضات و ہوا کی تسلیم و اطاعت سے مردانہ وار انکار کر دیا فی الحقیقت انھوں نے علمائے حق و سلف کی سنت

~~تازہ کر دی اور علمائے ہند کے لیے اپنی سنت حقہ~~

یادگار چھوڑ گئے"۔ [۵۱]

یہ تھی ہندوستان کی وہ بزرگ ترین ہستی جو مولانا کے نزدیک منصب امامت کی اہل تھی۔ حضرت شیخ الہند مولانا کے اصرار پر یہ منصب قبول کر لینے پر آمادہ بھی ہو گئے تھے اور یہ بات طے پا گئی تھی کہ ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کر دیا جائے گا لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے سفر حجاز کا ارادہ کر لیا اور مولانا آزاد کے بقول "میری کوئی منت و سماجت بھی انھیں سفر سے باز نہ رکھ سکی"۔ اس صورت میں کہ مولانا جس شخصیت کو اس منصب کے لیے اہل اور مستحق سمجھتے تھے، درمیان میں موجود نہیں تھی اس امر عظیم کو نہ ترک کر دیا جا سکتا تھا نہ التوا میں ڈالا جا سکتا تھا۔ مولانا نے اپنی ذمہ داری پہ کام جاری رکھا۔

مولانا کی نظربندی

اپریل ۱۹۱۶ء میں مولانا آزاد کو کلکتہ سے اخراج کا حکم ملا۔ مجبوراً وہ رانچی چلے گئے۔ بعد میں وہیں انھیں نظربند کر دیا گیا۔ اور اس طرح کام کا نقشہ یکسر پلٹ گیا۔ اور اگرچہ حوادث کی ہوش ربائی اور واقعات کی المناکی انتہا درجے کی تھی لیکن مولانا کی عزیمت و استقامت کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہ تھی مولانا کا ذہن و دماغ امید کی شمع جلائے کام کے نئے نقشے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

نظربندی سے رہائی

چار سال کی نظربندی کے بعد جب مولانا کو رہائی ملی تو وہ آئندہ زندگی، زندگی کے کاموں اور

---

[۵۱] خطبۂ صدارت تحریری، صفحہ ۱۰

ان کے طریق و اسلوب کی نسبت ایک مستحکم فیصلہ کر چکے تھے۔ ۲۳ر ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو پیغام کلکتہ کے مقالہ افتتاحیہ میں مولانا اپنے اس فیصلے اور عزم کی نسبت تحریر فرماتے ہیں:

"یکم جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو جب مجھے چار سال کی نظربندی سے رہا کیا گیا تو میں اپنی آئندہ زندگی، زندگی کے کاموں اور طریق و اسلوب کی نسبت خالی الذہن نہ تھا اور نہ اپنے ارادے کے بہنے کے لیے واقعات و حوادث کے کسی سیلاب کا منتظر تھا۔ میں نے ہمیشہ بہنے کی جگہ چلنے کی کوشش کی ہے اور اس وقت بھی اپنے سفر عمل کے لیے ایک طے شدہ راہ اختیار کر چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ مجھے کیا کرنا چاہیئے اور میری مشغولیت کا عنوان و طریق کیا ہو گا؟

حوادث زمانہ اور اصحاب عزائم

دنیا کے واقعات و حوادث، طوفان کی طرح اٹھتے اور سیلاب کی طرح آتے ہیں اور انسان کا کمزور ارادہ ہمیشہ اس کی سطح پر حباب کی طرح بہتا رہتا ہے۔ حکمت الہی نے اگرچہ انسان کو یہ طاقت بخشی ہے کہ اس طوفان و سیلاب کا مقابلہ کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو کشتی کی طرح اس کی لہروں پر بھی چل سکتا ہے

اور دنیا ان عزائم سے کبھی خالی نہ رہی جنھوں نے نہ صرف اس کا مقابلہ کیا ہے، بلکہ مرکب کی طرح لگام لگا کر جس طرف چاہا ہے، رخ پھیر دیا ہے، لیکن افسوس کہ زندگی اور ارادے کے اس کرہ میں بہت کم انسان ہیں جو خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو سمجھنا چاہتے ہیں اور ان سے بھی کم ہیں جو سمجھنے کے بعد برت سکتے ہیں۔ وکاین من آیۃ فی السموات والارض یمرون علیہا وہم عنہا معرضون (یوسف) زمین پر درختوں کے جھنڈ ہیں جو ہوا سے ہلتے ہیں، کنکر پتھر کے ڈھیر ہیں جن کو ٹھوکریں پامال کرتی ہیں، خس و خاشاک کے انبار ہیں جن کو آندھی اڑا لے جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کی بھی ٹولیاں اور بستیاں ہیں۔ جو اگرچہ دیکھتا اور سنتا ہے، سوچتا اور ارادہ کرتا ہے لیکن جب حوادث امنڈتے ہیں، واقعات و تغیرات بہنے لگتے ہیں تو وہ اپنی تمام ارادی اور ادراکی قوتوں کو خیرباد کہہ دیتا ہے اور پھر درخت کی طرح گر کر، پتھر کی طرح لڑھک کر، خس و خاشاک کی طرح آناً فاناً بہہ جاتا ہے! مقام انسانیت کا منارہ بہت بلند ہے لیکن اس کی دیواریں جمادات کی سطح ہی سے بلند ہوتی ہیں، اس لیے اگر اس کی چوٹی گرے گی تو وہیں پہنچے گی جہاں سے بلند ہوئی تھی۔ قرآن کریم نے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۰ ثم رددنٰہ اسفل سافلین ۰

عنایت الٰہی کی دستگیری

سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۵ء تک کے حوادث عالم کا سیلاب اگرچہ نہایت مہیب اور ہوش ربا تھا اور بہت مشکل تھا کہ ارادے اور فیصلے کی دیواریں اس کے مقابلے میں قائم رہ سکیں۔ عنایت الٰہی کی دست گیری سے میں نے اپنے ارادے اور عزم کو اس وقت بھی پوری طرح قائم واستوار پایا اور ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل پر مایوسی کو قبضہ نہ ملا۔ واقعات کی خطرناکی اور ناکامی میرے دل وجگر کو چیر دے سکتی تھی اور حوادث کی غم گینی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے سکتی تھی۔ لیکن وہ اس یقین وعزم کو نہیں نکال سکتی تھی جو اس کے ریشے ریشے میں بسا ہوا ہے اور صرف اسی وقت نکل سکتا ہے جب دل بھی سینے سے نکل جائے۔ وہ زمین کی پیداوار نہیں ہے کہ زمین کی کوئی طاقت اسے پامال کر سکے۔ وہ آسمان کی روح ہے اور بحکم تتنزل الملائکۃ ان لا تخافوا ولا تحزنوا' آسمان کی بلندیوں ہی سے اتری ہے پس نہ تو زمین کی امیدیں اسے پیدا کر سکتی ہیں اور نہ زمین کی مایوسیاں اسے ہلاک کر سکتی ہیں۔

نئے بنائے تعلیم کی تعمیر

سن ۱۹۱۶ء کے اواخر

میں جب کہ امیدوں اور آرزوؤں کی پوری دنیا الٹ چکی تھی اور اس کی ویرانیوں اور پامالیوں پر سے سیلاب حوادث پورے زور شور کے ساتھ گذر چکا تھا، تو میں رانچی کے ایک گوشۂ عزلت میں بیٹھا ہوا ایک نئی امید کی تعمیر کا سروسامان دیکھ رہا تھا اور گویا دنیا نے دروازے کے بند ہونے کی صدائیں سنی تھیں مگر میرے کان ایک نئے دروازے کے کھلنے پر لگے ہوئے تھے"

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

۱۹۱۸ء کے رمضان المبارک کا پہلا ہفتہ اور اس کی بیدار و معمور راتیں تھیں کہ جب میں نے انہی ہاتھوں سے امیدوں اور آرزوؤں کے نئے نقشوں پر لکیریں کھینچیں، جن سے تمام پچھلے نقشے چاک کر چکا تھا۔

ہمت نگر کہ صد ورق دفتر امید
صد پارہ کردہ ایم و بہ خوناب شستہ ایم [۵۱]

نیا نقشہ کار

اس نئے نقشہ کار کے مطابق مولانا کے پیش نظر تین بڑے مقاصد و مہمات تھے:

۱۔ رفقاء و طالبین کی ایک جماعت کی تعلیم و تربیت

---

۵۱ ذکر آزاد، ملیح آبادی، ص ۸۵ - ۸۲

۲۔ تصنیف و تالیف

۳۔ جماعتی اعمال یعنی تنظیم جماعت

مولانا فرماتے ہیں:

"چنانچہ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء میں جب میں نظر بندی کے گوشہ و قید و بند سے نکلا تو دو سال پیشتر کا یہ نقشہ عمل میرے سامنے تھا اور اس لیے نہ تو مجھے واقعات کی رفتار کا انتظار تھا نہ مزید غور و فکر کا بلکہ صرف شغل عمل شروع کر دینا تھا۔ میں نے آئندہ کے لیے جن امور کا ارادہ کیا تھا۔ ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ رانچی سے نکلتے ہی کسی گوشۂ عزلت میں رفقا و طالبین کی ایک جماعت لے کر بیٹھ رہوں گا اور اپنی زبان و قلم کی خدمات میں مشغول ہو جاؤں گا، تصنیف و تالیف کے علاوہ جو جماعتی اعمال پیش نظر تھے ان کے لیے بھی سیر و گردش اور نقل و حرکت کی ضرورت نہ تھی، قیام و استقرار ہی مطلوب تھا۔

چنانچہ اسی بنا پر رہائی کے بعد سیدھا کلکتہ کا قصد کیا اور اگرچہ تمام ملک سے پیغام ہائے طلب و دعوت آرہے تھے اور ہر طرف نظر بندوں کی رہائی کا ہنگامہ تہنیت و تبریک گرم تھا، لیکن میں کہیں نہ جا سکا اور سب سے عذر خواہ ہوا۔ میری طلب و جستجو نے مجھے مہلت نہ دی کہ اپنے

وجود کو لوگوں کی طلب جستجو کا سراغ ملنے لگا ہے

مرا کہ شیشۂ دل وزیارت سنگ است
کرا دماغ مے ناب و شیشہ و چنگ است [1]

جہاں تک طالبین حق کی تعلیم و تربیت کا کام تھا وہ قید سے رہائی اور آزادی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا تھا لیکن دیگر دونوں امور پر انھوں نے دوران نظر بندی ہی میں توجہ دی چنانچہ ان کے اوقات نظر بندی کا بڑا حصہ اپنے افکار کی ترتیب و تالیف میں بسر ہوا۔ جماعتی اعمال کی انجام دہی کے لیے بھی نقل و حرکت کی آزادی کی ضرورت تھی لیکن ایام نظر بندی میں بھی جس حد تک حالات نے اجازت دی ان سے فائدہ اٹھانے میں غفلت نہیں کی۔ چنانچہ صوبہ بہار کے احباب و مخلصین کو جن سے اس زمانے میں بھی ربط تھا، مولانا نے توجہ دلائی اور کام کی ابتدا کر دی۔

رہائی کے بعد کوشش

جنوری ۱۹۲۰ء میں مولانا رہا ہوئے تو ان کے پیش نظر کاموں کا یہی نقشہ تھا اور وہ اسی میں مصروف رہنا چاہتے تھے لیکن حالات کی نزاکت اور ملکی اور ملی مقاصد کی ناگزیر احتیاجات کی وجہ سے مولانا کو وقت اور ضرورت کے مطابق فیصلہ کر لینا پڑا۔ اس حالت میں قرارداده اسلوب عمل کی پہلی شقوں پر تو عمل نہیں ہو سکتا تھا لیکن تنظیم جماعت کا کام جاری رکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ تحریک خلافت کے ساتھ تنظیم جماعت کے کام کو

---

[1] ذکر آزاد، ملیح آبادی، صفحہ ۸۶

آگے بڑھانے اور تمام صوبوں تک اس دعوت کو پہنچانے میں مصروف ہوگئے انھوں نے اپنے مخلصین اور علمائے کرام کو اس طرف توجہ دلائی اور وسط سال تک وہ پورے ملک میں نظم جماعت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ صرف دائرہ عمل کی توسیع کا مرحلہ باقی رہ گیا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام ۱۳ر جولائی ۱۹۲۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"گذشتہ ماہ کے اواخر میں بمبئی گیا تھا تاکہ تمام معاملات ایک قطعی اور مختتم صورت اختیار کرلیں۔ ۔ ۔ بحمد اللہ معاملہ تنظیم جماعت من کل الوجوہ اتمام کو پہنچا۔ جزئیات و تفصیلات بھی طے پاگئیں۔ اب بجز توسیع دائرہ عمل کے کوئی مرحلہ باقی نہیں ہے اور وہ توفیق الٰہی پر موقوف ہے۔ ۔ ۔ بہر حال دائرہ عمل مکمل ہوچکا ہے۔ پنجاب سندھ، بنگال بالکل متفق و متحد ہے اور اب پوری تیزی سے کام جاری ہوگیا ہے۔" ؎۵۱

صوبوں میں تنظیم جماعت

اس وقت تک مختلف صوبوں میں تنظیم کی صورت یہ تھی:

۱۔ پنجاب میں مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا عبداللہ قصوری اور مولانا محی الدین احمد قصوری تنظیم جماعت کے کاموں کے ذمہ دار تھے۔

۲۔ سندھ میں پیر سید تراب علی شاہ راشدی مولانا رح کی جانب

؎۵۱ مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۹۱ء ص ۲۲

سے مجاز اور تنظیم جماعت کے کاموں کے [illegible]

۳۔ یوپی میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ماذون و مامور تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کو اپنا مرکز بنا کر کام شروع کیا۔

۴۔ صوبۂ بنگال کے صدر مقام کلکتہ میں خود مولانا کی ذات گرامی دعوت اور تنظیم جماعت کے کاموں کے لیے مرکزی حیثیت رکھتی تھی اور وہ خود سرگرمی کے ساتھ بیعت و ارشاد کے کاموں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا کے علاوہ سنہ ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد منیرالزماں اسلام آبادی امارت شرعیہ اور تنظیم جماعت کے قیام کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔

۵۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم بہار میں تنظیم جماعت اور امارت شرعیہ کے قیام کے لیے مولانا کی جانب سے مامور تھے۔

چند مریدین مخلصین

مولانا کے ان خلفائے مجاز کے علاوہ سینکڑوں مرید تھے ان میں سے جن کے نام معلوم ہو سکے یہ ہیں۔

(۱) خواجہ عبدالحی فاروقی (۲) مستری محمد صدیق مرحوم (کپورتھلہ) (۳) مولانا محمد اسمٰعیل سلفی (گوجرانوالہ) (۴) صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (امرتسر) (۵) شیخ قمرالدین مرحوم (لاہور) (۶) مولانا غلام رسول مہر (لاہور) (۷) غالباً سب سے آخری شخص جنھوں نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی مولوی محمد یونس خالدی (لکھنؤ) ہیں۔

میثاق اسلامی

جب کوئی صاحب اخلاص مسلمان جماعتی زندگی کی اہمیت کو سمجھ لیتا اور نظم جماعت کا پابند اور احکام شرعیہ کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر صدق دل سے آمادہ ہو جاتا تو مولانا اس سے سنت نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے مطابق ایک عہد لیتے تھے۔ یہ عہد خانقاہی نظام اور تصوف کے کسی خاص سلسلے کے اعتقاد و وابستگی کا عہد نہیں ہوتا تھا بلکہ پورے اخلاص نیت کے ساتھ احکام شریعت کے کامل اتباع، پوری زندگی کو مرضیات الٰہی کے حوالے کر دینے اور اپنے تمام مالوفات مطلوبات اور تمام تعلقوں اور رشتوں سے زیادہ اللہ کو، اس کے رسول کو، اس کی شریعت اور اپنے تمام ذاتی و انفرادی مفادات کے مقابلے میں اجتماعی اور امت کے مصالح کو زیادہ عزیز و مقدم رکھنے اور اس کے لیے اپنی جان، اپنا مال اور اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنے کا عہد ہوتا تھا۔

اس سلسلے میں مولانا کی دو تحریریں پیش نظر ہیں۔ ایک تحریر ۱۹۲۱ء کی ہے اور "مولانا ابوالکلام آزاد کا پیغام عزیزان پنجاب کے نام" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر نے یہ نایاب تحریر "نقش آزاد" میں شامل کر کے ضائع ہونے سے محفوظ کر دی ہے دوسری تحریر بیعت کا وہ مسودہ ہے جو مولانا نے عبدالرزاق ملیح آبادی کو لکھ کر دیا تھا۔ یہ دونوں تحریریں چونکہ پیش نظر مقصد کی وضاحت کے لیے

ضروری ہیں اس لیے درج کی جاتی ہیں۔

پہلی تحریر جو زمیندار لاہور میں شائع ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد مندرجہ ذیل پانچ باتوں کی بیعت نظم جماعت کے وقت عہد لیتے تھے:

اوّلاً: امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور توصیہ صبر کا۔ یعنی ہمیشہ نیکی کا حکم دیں گے، برائی کو روکیں گے، صبر کی وصیت کریں گے۔

ثانیاً: الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کا۔ یعنی اس دنیا میں ان کی دوستی ہوگی تو اللہ کے لیے اور دشمنی ہوگی تو اللہ کے لیے۔

ثالثاً: لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم کا۔ یعنی سچائی کے راستے میں وہ کسی کی پروا نہیں کریں گے اور خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈریں گے۔

رابعاً: اس بات کا کہ وہ اللہ اور اس کی شریعت کو دنیا کے سارے رشتوں، ساری نعمتوں اور ساری قوتوں سے زیادہ محبوب رکھیں گے۔

خامساً: اطاعت فی المعروف کا۔ یعنی شریعت کے ہر حکم کی اطاعت بجالائیں گے جو ان تک پہنچایا جائے گا۔"[1]

---

[1] نقش آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر، ۱۹۵۹ء، ص ۳۴۴ - ۳۴۳

دوسری تحریر جو مولانا نے عبدالرزاق ملیح آبادی کو لکھ کر دی تھی مندرجہ ذیل ہے:

آمنت باللہ وبما جاء من عند اللہ و آمنت برسول اللہ وبما جاء من عند رسول اللہ و اسلمت واقول ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لا شریک لہ و بذلک امرت وانا اول المسلمین۔

بیعت کرتا ہوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ خلفا ونائبین کے اس بات پر کہ

۱۔ اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعتقاد اور عمل پر قائم رہوں گا۔ اگر استطاعت پائی۔

۲۔ پانچ وقت کی نماز قائم رکھوں گا، رمضان کے روزے رکھوں گا، زکوۃ اور حج ادا کروں گا۔ اگر استطاعت پائی

۳۔ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دوں گا، برائی کو روکوں گا، صبر کی وصیت کروں گا۔

۴۔ میری دوستی ہوگی تو اللہ کی راہ میں اور دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

۵۔ اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں اپنی جان سے، اپنے مال سے، اپنے اہل و

عیال سے، دنیا کی ہر نعمت اور دنیا کی ہر لذت سے زیادہ اللہ کو، اس کے رسول کو، اس کی شریعت کو، اس کی امت کو محبوب رکھوں گا اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب وسنت کے مطابق دیا جائے گا سمع والطاعۃ کے ساتھ اس کی تعمیل کروں گا۔" ۵۱

شیخ الہند کی ہندوستان واپسی

مارچ ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند کو مالٹا کی نظربندی سے رہائی ملی اور جون میں وہ ہندوستان پہنچے لیکن نظربندی کے زمانے کی سخت تکالیف سے ان کی صحت تباہ ہو چکی تھی۔ اس وقت ان کی عمر انہتر (۶۹) برس کی تھی اگرچہ ان کے دل میں کبھی نہ بجھنے والی ایمان کی انگیٹھی دہک رہی تھی لیکن ان کا جسم امت کے غم میں پگھل چکا تھا، قوی جواب دے چکے تھے ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ کوئی ذمہ داری اٹھائیں۔ ہندوستان تشریف لانے کے بعد وہ تقریباً چھ ماہ زندہ رہے یہ مدت بھی عوارض ومعالجات کی فکر میں گذری۔ اس کے باوجود حلقہ دیوبند کے بعض حضرات کی نہایت مخلصانہ خواہش تھی کہ حضرت شیخ الہند اس منصب کو قبول فرمالیں۔ دوسری طرف حلقہ فرنگی محل مولانا عبدالباری کی امامت کے لیے کوشاں تھا۔

---

۵۱ ذکر آزاد۔ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ کلکتہ، ۱۹۶۰ء ص ۲۵-۲۶

شیخ الہند رح کی تائید

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم مولانا آزاد کی امامت کے لیے میدان ہموار کر رہے تھے ۔ اسی سلسلے میں انھوں نے حضرت شیخ الہند سے ملاقات کی۔ اس کی روداد خود انہی کی زبانی سنئے :

"شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مرحوم و مغفور مالٹا کی نظر بندی سے چھوٹ کر پہلی دفعہ لکھنؤ تشریف لائے[1] اور فرنگی محل میں ٹھیرے ۔ خبر ملی کہ فرنگی محل والے اس کوشش میں ہیں کہ مولانا عبدالباری صاحب کی امامت پر انھیں راضی کریں ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خود شیخ الہند کے بعض رفیق شیخ کے لیے یہ منصب چاہتے ہیں ۔ میں نے شیخ الہند سے تنہائی میں ملاقات کی ۔ رسمی باتوں کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی امامت کا تذکرہ چھیڑا شیخ نے فرمایا امامت کی ضرورت مسلم ہے، عرض کیا حضرت سے زیادہ کون اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اس منصب کے لیے وہی شخص موزوں ہو سکتا ہے جو زیادہ سے زیادہ ہوش مند، مدبر اور ڈپلومیٹ ہو ۔ جس کی استقامت کو نہ کوئی تشویق متزلزل کر سکے نہ کوئی ترہیب ... شیخ الہند نے اتفاق ظاہر کیا تو عرض کیا کہ آپ کی رائے

---

[1] واضح رہے کہ یہ واقعہ اگست ۱۹۲۰ء کا ہے ۔

میں اس وقت امامت کا اہل کون ہے ؟ یہ بھی اشارہ کہہ دیا کہ بعض لوگ اس منصب کے لیے خود آپ کا نام لے رہے ہیں اور بحمداللہ اہل بھی ہیں۔ شیخ بڑی معصومیت سے مسکرائے اور فرمایا " میں ایک لمحے کے لیے تصور نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کا امام بنوں"۔[۹] عرض کیا کہ کچھ لوگ مولانا عبدالباری صاحب کا نام لے رہے ہیں۔ موصوف کا تقویٰ و استقامت مسلم ہے مگر مزاج کی کیفیت سے آپ بھی واقف ہیں۔ شیخ نے سادگی سے جواب دیا، مولانا عبدالباری کے بہترین آدمی ہونے

سلہ ۹ اس ایک جملے میں حضرت شیخ الہند نے اپنی پوری سیرت بیان کردی ہے۔ لاریب ان کا خلوص، ان کی بے نفسی اور للہیت اسی درجے کی تھی، وہ پہلے بھی حضرت مولانا آزاد کے اصرار اور ملت اسلامیہ کے دینی و سیاسی مصالح کے پیش نظر اور کسی کو آمادہ نہ پاکر ہی منصب امامت قبول کرنے پر آمادہ ہوئے ہوں گے۔ اب انھوں نے دیکھا کہ تحریک کا کام شروع ہو چکا ہے اور مولانا آزاد اس کے لیے ہر طرح اہل اور آمادہ بھی ہیں تو فوراً خود کو اس سے الگ کر لیا اور مولانا آزاد پر اپنا اعتماد ظاہر فرما دیا۔ اسی طرح مجھے یقین ہے کہ اگر حضرت شیخ الہند ذرا بھی اس منصب کو قبول کرنے پر آمادہ نظر آتے تو سب سے پہلے مولانا آزاد ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے کہ ان کی ملی دردمندی بھی اسی درجے کی تھی۔ بہرحال یہی وجہ تھی کہ حضرت شیخ الہند کے ہندوستان تشریف لے آنے کے بعد مولانا آزاد کے لیے بیعت امامت کا سلسلہ جاری رہا۔

میں شبہ نہیں مگر منصب کی ذمہ داریاں کچھ اور ہی ہیں'
عرض کیا: اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں آپ
کی کیا رائے ہے ؟ شیخ نے متانت سے فرمایا میرا انتخاب
بھی یہی ہے۔ اس وقت مولانا آزاد کے سوا کوئی شخص
"امام الہند" نہیں ہو سکتا۔ ان میں وہ سب اوصاف
جمع ہیں' جو اس زمانے میں ہندوستان کے امام میں
ہونا ضروری ہیں۔ . . . عرض کیا اس گفتگو کو پبلک
میں لا سکتا ہوں ؟ انھوں نے اجازت دیدی ؛؛ [۵]

حضرت شیخ الہند کی جانب سے مولانا آزاد کی امامت کی تائید گویا تمام علمائے دیوبند کی اور جمعیتہ العلمائے ہند کی تائید وحمایت کا اعلان تھا یہی وجہ ہے کہ نہ صرف اس وقت اس حلقے کی طرف سے مولانا کی امامت کی مخالفت میں کوئی آواز نہیں اٹھی بلکہ ہمیشہ ملکی سیاست اور ملی مسائل میں ان کی قیادت پر اعتماد اور ان کی رائے کو اہمیت دی گئی ۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی

حضرت شیخ الہند کے علاوہ ایک اور شخصیت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی تھی جو صوبہ یوپی میں ہزارہا لوگوں کے مرکز عقیدت اور مرجع ومطاع کی حیثیت رکھتی تھی۔ مولانا محمد علی اور حسرت موہانی اسی خانقاہ کے حلقہ بگوشوں میں سے تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے

[۵] ذکر آزاد، ملیح آبادی، صفحہ ۳۶ - ۳۴

اسی زمانے میں ان سے بہت اچھے روابط تھے۔ پیش نظر مقاصد کے لیے ضروری تھا کہ ان کی طرف سے معاملے کو صاف کر لیا جائے۔ مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"اب مولانا عبدالباری صاحب سے نپٹنا تھا۔ مولانا سے میرے گھرے تعلقات تھے اور اندیشہ تھا کہ میری اس مہم کا حال معلوم ہوگا تو مجھے نہ جانے کتنا برا سمجھیں گے مگر جب بات چیت ہوئی تو خندہ پیشانی سے کہنے لگے:

مولانا آزاد کے سوا کسی اور کا نام امامت کے لیے لینا قوم سے غداری ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے شیخ الہند سے معاملہ صاف کر لیا اور میں پہلا آدمی ہوں جو مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ ہمیں ہندوستان آزاد کرانا ہے اور اسلامی دنیا کو انگریز کے چنگل سے نکالنا ہے۔ میں ایک نکٹے بچے حبشی غلام کو بھی سردار مان لوں گا اگر انگریز سے جہاد کرے اور انگریز سے لڑے۔"

حضرت مولانا فرنگی محلی کے یہ جذبات صالحہ و صادقہ تھے لیکن ملیح آبادی کی نظر ان کے مزاج و فکر کے پیچ و خم اور گرد و پیش کے اصحاب اغراض پر بھی تھی اس لئے ان کے نزدیک صرف یہ گفتگو کافی نہ تھی۔ کوئی ایسی صورت بھی ہونی چاہیئے تھی کہ اس رائے سے ان کے ہٹنے کا امکان کم سے کم رہ جائے۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"مگر میں جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ جانتا تھا مولانا آزاد سے بڑی چشمک ہے گو ظاہری محبت و خلوص کی کمی نہیں۔ میں نے درخواست کی کہ اپنا جواب تحریر کی صورت میں لے آئیں۔"

ایک تاریخی تحریر مولانا فرنگی محلی نے فوراً حسب ذیل تحریر لکھ دی لیکن تحریر میں جذبات و اخلاص کی وہ شدت نہیں جو گفتگو میں تھی نیز تحریر این وآں سے خالی نہیں۔ تحریر یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً۔ مکرمی دام مجدہٗ السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہٗ

مسئلہ امامت یا شیخ الاسلامی کے متعلق مجھے جمہور کی موافقت کے سوائے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ جو اندیشہ ہے وہ بار بار اہل الرائے سے ظاہر کر چکا ہوں۔ باوجود اس کے پھر بھی مسلمانوں کی تجویز بسر و چشم قبول کرنے کو تیار ہوں۔ خود مجھ سے بارہا اس منصب کے قبول کرنے کی بعض اہل الرائے نے خواہش کی، مگر میں نے اپنی عدم اہلیت کے باعث اس امانت کا بار اٹھانا منظور نہیں کیا۔ نہ آئندہ قبول کرنے کا ارادہ ہے

مولانا محمود حسن صاحب سے دریافت کیا تو وہ بھی اس بارے متحمل نظر نہیں آتے۔ مولانا ابوالکلام صاحب اسبق وآمادہ ہیں۔ ان کی امامت سے بھی مجھے استنکاف نہیں۔ بسروچشم قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوں بشرطیکہ تفریق جماعت کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا تو اہل ہیں اگر کسی اہل کو تمام یا اکثر اہل اسلام قبول کریں گے تو مجھے وہ لوگ سب سے زیادہ اطاعت گذار و فرمانبردار پائیں گے اصل یہ ہے کہ یہ تحریک امامت اپنی سمت سے جاری کرنا نہیں چاہتا نہ کسی کو منتخب کرکے اس کے اعمال کا اپنے اوپر بار لینا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی جماعت کا تابع ہوں اس سے زائد مجھے اس تحریک سے تعرض نہیں ہے

والسلام بندہ فقیر محمد عبدالباری

ملیح آبادی نے مولانا آزاد کو یہ تحریر بھیج دی اور حالات سے مطلع کیا۔ مولانا آزاد نے اس کے جواب میں ایک مصرع لکھا:

یارما ایں دارد و آں نیز ہم[1]

ابھی ایک سال بھی نہیں گذرا تھا کہ مولانا فرنگی محلی علیہ الرحمۃ کے مزاج وفکر کے پیچ وخم اور اہل اغراض کی مساعی بروئے کار آئیں۔ اسی این و آں

---

[1] ذکر آزاد ملیح آبادی ص ۳۸-۳۶

سے ریموٹ پیدا کر دی[۵] اور ٹھیک اسی وقت جبکہ پنجاب، سندھ، بنگال میں تنظیم تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ مولانا آزاد نے یہ معاملہ خود اپنے ہاتھ میں رکھنے کے بجائے جمعیتہ العلماء ہند کے سپرد کر دیا۔

جمعیتہ العلماء ہند کا اجلاس دہلی

۷، ۸، ۹ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ، (۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء) کو جمعیتہ العلماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس دہلی میں حضرت شیخ الہند کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اجلاس میں ہندوستان کے مختلف اضلاع و صوبہ جات سے پانچ سو سے زائد نمائندہ علمائے کرام نے شرکت فرمائی۔ مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی نائب امیر شریعت صوبۂ بہار و اڑیسہ لکھتے ہیں:

> "جمعیتہ العلماء ہند کا یہ دوسرا اجلاس عام تھا جس میں اسلامی ہند کے ذمہ دار علما اور ارباب حل و عقد جمع تھے اور در اصل صحیح معنوں میں یہی پہلا اجتماع تھا

---

[۵] حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے مزاج و سیرت کے جس پہلو کی جانب مولانا ملیح آبادی نے اشارہ کیا ہے اس باب میں وہ منفرد نہیں ہیں بلکہ ان کے نہایت مخلصین کو بھی ان سے یہ شکایت رہی ہے۔ ان میں مولانا شوکت علی، خواجہ غلام نظام الدین، مولانا منیر الزماں اسلام آبادی وغیرہم شامل ہیں۔ اس سلسلے میں نقوش لاہور کا خطوط نمبر جلد دوم صفحات ۶۳-۶۱، ۸۳-۱۸۲، ۹۸-۹۷ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

اور آئینی حیثیت سے یہ پہلا موقع تھا کہ آئینی طریقے
پر پورے اسلامی ہند کے لیے امیر شریعت یا امیر الہند کا
مسئلہ طے کیا جائے ۔ اس اجلاس کے موقع پر حضرت
مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نے مسئلہ امارت

فی الہند کو ارباب حل و عقد کے سامنے رکھا اور اس
فریضۂ حیات کی طرف توجہ دلائی جو آئین اسلامی کی رو
سے ان پر واجب تھا اور سیاست دینیہ کا صحیح مدادا
تھا۔ حضرت شیخ الہند نے اسلامی اور دینی سیاست
کے اس صحیح مدادے کی سب سے پہلے حمایت کی۔ اس
وقت حضرت شیخ الہند ایسے ناساز تھے کہ حیات کے
بالکل آخری دور سے گزر رہے تھے. نقل و حرکت کی
بالکل طاقت نہ تھی. لیکن باوجود اس کے ان کو اصرار
تھا کہ اس نمائندہ اجتماع میں جب کہ تمام اسلامی ہند
کے ذمہ دار اور ارباب حل و عقد جمع ہیں امیر الہند
کا انتخاب کر لیا جائے اور میری چارپائی کو اٹھا کر
جلسہ گاہ میں لے جایا جائے. پہلا شخص میں ہوں
گا جو اس امیر کے ہاتھ پر بیعت کرے گا. مگر نزاکت حال
کو دیکھ کر طبیب و ڈاکٹر اور خدام مخلصین کی اس وقت
رائے ہوئی کہ حضرت شیخ الہند کو اس وقت تکلیف

نہ دی جائے اور اس مسئلے کو حضرت شیخ الہند کی صحت پر اٹھا رکھا جائے تاکہ پورے اطمینان اور انشراح صدر کے ساتھ اس کو عمل میں لایا جائے۔

نجی طور پر صوبائی امارت پر بھی گفتگو ہوئی اور اس میں مضائقہ نہ سمجھا گیا۔ لیکن حضرت شیخ الہند کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ آپ اس مرض سے جانبر نہ ہو سکے اور جمعیتہ العلماء ہند کے اس اجلاس کے ایک ہفتہ بعد ہی آپ دار فانی سے رحلت فرما گئے۔" ؎۵

جمعیتہ العلمائے ہند کے اجلاس دہلی میں حضرت شیخ الہند کی علالت کی وجہ سے نظام امارت شرعیہ اور انتخاب امیر کے بارے میں کوئی قطعی اور حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا اور نہ صوبہ وار نظام امارت کے قیام اور انتخاب امیر کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جا سکا تھا۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں اس مسئلے کے التوا و تعویق کے مضمرات بھی تھے جنھیں نظر انداز نہیں کر دیا جا سکتا تھا۔ اس لیے انھوں نے مولانا محمد سجاد بہاری اور چند خاص احباب و مخلصین کے مشورہ و ایما سے یہ طے کر لیا کہ سب سے پہلے صوبہ بہار میں نظام امارت شرعیہ کا قیام اور امیر شریعت کا انتخاب عمل میں لایا جائے جہاں اس کے زیادہ اور روشن امکانات ہیں کہ یہ امر عظیم بہ حسن و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا چنانچہ

؎۵ تاریخ امارت، مولانا عبدالصمد رحمانی، ۱۳۶۹ھ ص ۵۲ - ۵۳

مولانا سجاد بہاری مرحوم نے ایک طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق دہلی سے واپس ہوتے ہی نہایت سرگرمی کے ساتھ قیام امارت شرعیہ کے لیے کام شروع کردیا۔ مولانا عبدالصمد رحمانی صاحب کے الفاظ میں ان کے مساعی جمیلہ کی مختصر روداد یہ ہے

"ربیع الاول ۱۳۳۹ھ (نومبر ۱۹۲۰ء) کے اجلاس جمعیت علمائے ہند دہلی میں حسب حضرت شیخ الہند کی علالت اور ان کی نزاکت حال کی وجہ سے مسئلہ امارت فی الہند کا التوا ہوگیا اور اس اجلاس میں امیر الہند کا انتخاب نہ ہوسکا اور اس کے ایک ہی ہفتے کے بعد حضرت شیخ الہند کا انتقال بھی ہوگیا تو حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نئی عزیمت لے کر دہلی سے واپس ہوئے اور آپ کی اولوالعزمانہ قوت فیصلہ نے آپ کے قلب میں اس ارادے کو راسخ کردیا کہ علما کی جمعیت کی طرح بغیر کسی انتظار و تعویق کے امارت کے مسئلے کی بنیاد بھی پہلے صوبہ بہار میں رکھی جائے اور اس سب سے بڑے دینی مسئلے اور اہم فریضے میں بھی اسلامی ہند کے لیے صوبہ بہار ہی نمونہ بنے اور سیاست دینی کے اس نظریے کو جو دار الحرب میں بقدر وسعت عمل میں لانا آئین اسلامی کی رو سے وقت کا سب سے اہم اور

وجوبی مسئلہ ہے۔ اس کے نظام کو عملی رنگ میں برت کر اسلامی ہند کے اقدام وعمل کے لیے راہ کھول دے۔"

تجاویز جمعیت علمائے بہار

چنانچہ مولانا سجاد بہاری مرحوم نے اس سلسلے میں علمائے بہار سے انفرادی گفتگو اور تحریری مشاورت کے بعد رجب ۱۳۳۹ھ (مارچ ۱۹۲۱ء) میں جمعیت علمائے بہار کی مجلس منتظمہ کا پھلواری شریف میں جلسہ طلب کیا اور اجلاس میں یہ تجویز بالاتفاق منظور کی گئی:

"یہ جمعیت تجویز کرتی ہے کہ صوبہ بہار اور اڑیسہ کے محکمہ شرعیہ کے لیے ایک عالم اور مقتدر شخص کا امیر ہونا انتخاب کیا جائے جس کے ہاتھ میں تمام محاکم شرعیہ کی باگ ہو اور اس کا ہر حکم مطابق شریعت ہر مسلمان کے لیے واجب العمل ہو نیز تمام علماء و مشائخ اس کے ہاتھ پر خدمت و حفاظت اسلام کے لیے بیعت کریں۔ یہ بیعت سمع و طاعت کی ہوگی جو بیعت سلسلۂ طریقت کے علاوہ ایک ضروری اور اہم چیز ہے۔

یہ جمعیت متفقہ طور پر تجویز کرتی ہے کہ انتخاب امیر محکمہ شرعیہ کے لیے ایک خاص اجلاس علمائے بہار کا بمقام پٹنہ وسط شوال میں منعقد کیا جائے۔

اس اجلاس کے بعد پٹنہ میں اجلاس خصوصی کے نظم

کی داغ بیل ڈال دی گئی اور ایک مضبوط مجلس استقبالیہ کا قیام عمل میں آیا۔ حضرت مولانا سید شاہ حبیب الحق صاحب (سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ، منگل تالاب، پٹنہ) صدر مجلس استقبالیہ جناب حکیم عبدالحی صاحب (پروفیسر طبیہ کالج، پٹنہ) ناظم اور مولانا اعتماد حسین صاحب (امام مسجد لون، پٹنہ) خازن منتخب ہوئے اور اجلاس خصوصی کی صدارت کے لیے مولانا ابو الکلام صاحب آزاد کا نام منظور ہوا۔

مجلس استقبالیہ پورے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہوگئی، اس کے سامنے جماعتی زندگی کی ایک جدید دنیا تھی، جدید دور کا آغاز تھا، نئی نوعیت کا ولولہ تھا، جوش تھا، اخلاص تھا، اُمت اور جماعت کی بہتری کا والہانہ جذبہ تھا، جماعتی ابتری اور انتشار پر دل میں درد تھا اور ہر رکن اس راہ میں انتہائی شغف سے رضاکارانہ طریق پر خدمت انجام دے رہا تھا۔“ [۱]

بہار میں نظم جماعت کا قیام

جمعیت علمائے بہار کا یہ خصوصی اجلاس ۱۸، ۱۹ شوال ۱۳۳۹ھ (مطابق ۲۵-۲۶ جون ۱۹۲۱ء) کو حسب قرار داد مولانا ابو الکلام آزاد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں بقول عبد الصمد رحمانی صاحب مختلف اضلاع صوبہ بہار و اڑیسہ کے چار پانچ سو علمائے کرام نے شرکت فرمائی۔

---

[۱] تاریخ امارت ص ۵۹-۵۷

عام شرکائے اجلاس کی تعداد موصوف کے اندازے کے مطابق چار ہزار تھی
۱۰ شوال کو بعد نماز عصر امیر شریعت کے انتخاب کی کارروائی عمل میں آئی
اور متفقہ طور پر حضرت مولانا سید شاہ بدرالدین علیہ الرحمہ (سجادہ نشین پھلواری شریف
ضلع پٹنہ) کو صوبہ بہار کا امیر شریعت اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم کو نائب
امیر شریعت منتخب کر لیا تھا۔ ساتھ ہی نو ارکان کی ایک مجلس شوریٰ کے
انتخاب کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے انتخاب کے لیے مولانا سجاد مرحوم، مولانا
عبدالوہاب صاحب (دربھنگہ) اور مولانا محمد صدیق صاحب پر مشتمل تین افراد
کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

اس طرح جمعیت علمائے بہار خصوصاً مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب
کی کوششوں سے بہار میں امارت شرعیہ کا نظم قائم ہو گیا اور علمائے بہار نے
سبقت بالخیرات کا وہ قیام حاصل کر لیا جس پر وہ بجا طور فخر کر سکتے ہیں جمعیت
علمائے ہند کے سالانہ اجلاس لاہور (نومبر ۱۹۲۱ء) میں مولانا ابوالکلام آزاد
فرماتے ہیں:

"گزشتہ موسم گرما میں جب اس طرف سے مایوسی ہو گئی کہ
تمام ملک کے لیے کوئی متفقہ و متحدہ نظم قائم ہو تو پھر یہ ارادہ
کیا کہ اولاً صوبہ وار تنظیم کا کام شروع کر دیا جائے، چونکہ صوبہ بہار
میں تین چار سال سے ابتدائی بنیاد کام کر رہی تھی اس لیے
سب سے پہلے اس کی طرف توجہ ہوئی اور میں نہیں جانتا کہ
کن لفظوں میں حضرات علمائے بہار کو مبارکباد دوں کہ
انہوں نے سبقت بالخیرات کا مقام اعلیٰ حاصل کیا اور جمعیۃ

العلماء بہار کے جلسے میں تین سو کے مجمع علما نے بالاتفاق

اپنا امیر شریعت منتخب کر لیا۔"[1]

ٹھیک اسی زمانے میں جب کہ بہار کے علمائے حق نے نظامِ امارت شرعیہ حقہ کے قیام کے لیے سرگرمی سے کام شروع کیا۔ بعض حضرات نے اس مسئلے میں چون وچرا شروع کر دی اور اگرچہ اس مسئلے میں احکام شرعی قطعی طور پر واضح تھے لیکن شکوک وشبہات کا اظہار کیا جانے لگا۔ اور ایک نہایت صاف اور واضح مسئلے میں پیچیدگیاں پیدا کی جانے لگیں۔ اس موقع پر مولانا سجاد بہاری مرحوم نے علمائے کرام کے نام ایک نہایت اہم اور تاریخی مکتوب شائع فرمایا جس میں اس مسئلے کی شرعی حیثیت پر نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی اور ان شکوک وشبہات اور اعتراضات کا نہایت شافی جواب دیا جو بعض جوانب سے کیے جا رہے تھے۔ الحمدللہ کہ مولانا سجاد بہاری کی یہ کوششیں رائیگاں نہ گئیں اور صوبہ بہار میں نظام امارت شرعیہ کے قیام میں ان اعتراضات کا کوئی اثر نہ پڑا۔

مجلس شوریٰ کا فیصلہ

حضرت شیخ الہند کا سانحۂ ارتحال بہت عظیم و المناک تھا۔ اس سانحے نے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ناپختہ عزائم اور جذبۂ ایثار سے تہی دامن اصحاب نے دارالعلوم کی زندگی میں اپنی آرزوؤں اور ولولوں سے ایک ہلچل پیدا کر دی اور سیاسی میدان میں بھی اکابر دیوبند کی روایت کے برخلاف انگریزوں کی طرف

---

[1] خطبہ صدارت تحریری ص ۵۲

میلان پیدا ہو گیا۔ لیکن حضرت شیخ الہند نے اپنے افکار و بیرت سے جمعیت علماء کی جس راستے کی طرف رہنمائی کی تھی، وہ اس پر آگے بڑھتی رہی۔

جمعیت کے سالانہ اجلاس دہلی کے بعد مجلس شوریٰ کا ایک خاص اجلاس اس مسئلے کے تصفیے کے لیے دہلی میں بلایا گیا۔ اس میں نہ صرف یہ کہ نظم جماعت کے کام کو جمعیت کے مقاصد کار میں شامل کر لیا گیا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ جمعیت کا آئندہ سالانہ اجلاس مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں لاہور میں منعقد کیا جائے۔ شوریٰ کا یہ فیصلہ فی الحقیقت دعوت و تنظیم کے کام میں مولانا آزاد کی اظہارِ اعتماد، ان کی رائے اور مساعی سے اتفاق اور انہیں اپنے پورے تعاون کا یقین دلانا تھا۔ حالات و مصالح امت کی بنا پر یہ فیصلہ نہایت اہم تھا اگر جمعیت یہ فیصلہ نہ کرتی تو اس کی دینی و سیاسی بصیرت اور سعی و عمل کے میدان میں اس کی قیادت کی اہلیت کے بارے میں شبہ کیا جا سکتا تھا۔

جمعیت علمائے ہند کا اجلاس لاہور

شوریٰ کے فیصلے کے مطابق نومبر ۱۹۲۱ء میں لاہور میں مولانا آزاد کی زیرِ صدارت جمعیت کا عظیم الشان سالانہ اجلاس ہوا۔ مولانا نے اس موقع پر جو خطبہ صدارت پیش کیا وہ ان کی دینی بصیرت اور سیاسی تدبر کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ مولانا کا یہ پورا خطبہ جمعیت کے مقاصد کار اور تنظیم جماعت کی ضرورت و اہمیت کے تعارف و تشریح پر مشتمل ہے۔ مولانا کے خطبہ صدارت کے ایک ایک حرف سے اتفاق کیا گیا۔ امارت شرعیہ فی الہند کے

قیام کی تجویز منظور کر لی گئی اور امیر شریعت کے انتخاب کے لیے اصول و شرائط منضبط و منظور کر لیے گئے۔ حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تقریر میں مولانا کے خیالات کی توثیق فرمائی۔ مولانا کی اصابت رائے اور منصب امامت کے لیے ان کی اہلیت کا صاف صاف اعتراف کیا اور کہا کہ امام الہند کے لیے جو شرائط ضروری ہیں وہ سب مولانا آزاد میں موجود ہیں اور یہ کہ وہ انھیں امام الہند تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رح لکھتے ہیں:

لہ مولانا انور شاہ کاشمیری علیہ الرحمہ اپنے ذہنی کمالات، اخلاقی محاسن اور علم و فضل کے لحاظ سے متاخرین علمائے ہند میں نادر روزگار شخصیت تھے۔ وہ اپنے عہد میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور حقانیت اسلام کی دلیلوں میں سے ایک روشن دلیل تھے۔ آپ کی وفات پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے فرمایا "مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ تقی الدین، ابن دقیق العید اور سلطان العلماء حضرت شیخ عزالدین بن عبدالسلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا ہوں کہ ہاں دیکھا ہے! کیونکہ صرف زمانے کا تقدم و تاخر ہے، ورنہ اگر حضرت شاہ صاحب بھی چھٹی یا ساتویں صدی ہجری میں ہوتے تو اسی طرح آپ کے مناقب و محامد بھی تاریخ کا گراں مایہ سرمایہ ہوتے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجر، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا انتقال آج ہو رہا ہے۔

ان کی سیرت کی عظمت کے لیے یہ واقعہ کفایت کرتا ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

"ایک دفعہ جیسا کہ میں نے سُنا ہے، لاہور میں دیو بند کی جماعت کے سربرآوردہ حضرات نے مولانا ابوالکلام آزاد کی امارت کی بیعت کے ساتھ رضامندی کا اعلان کر دیا تھا خیال آتا ہے کہ مولانا انور شاہ (کاشمیری) مولانا شبیر احمد (عثمانی) اور مولانا حبیب الرحمان (دیوبندی) جیسی ممتاز ہستیوں کی طرف سے اس رضامندی کا اعلان کیا جا چکا تھا مگر اعلان سے آگے بات نہ بڑھی"[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

۱۹۱۳ء میں مولانا عبیداللہ سندھی کے دارالعلوم دیوبند سے نکلنے کا ایک سبب مولانا شبیر احمد عثمانی کے ساتھ مولانا کاشمیری بھی تھے۔ ان دونوں حضرات نے بعض مفروضہ مسائل میں مولانا سندھی کا تعاقب کیا، ان پر کفر کا فتویٰ لگوایا اور دیوبند سے انہیں مظلومانہ نکلنے پر مجبور کیا۔ لیکن جونہی مولانا ئے کاشمیری کو اپنی فکر ورائے کی غلطی کا احساس ہوا انھوں نے مولانا سندھی مرحوم سے معافی مانگ لی اور پھر آخر تک ان کی زندگی کے شب وروز اسی یوسف مقصود کی تلاش وجستجو میں بسر ہوئے جن کی تلاش میں حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی زندگی کے عیش وراحت کو قربان کر دیا تھا اور مولانا سندھی نے جس کے لیے جلا وطنی اور غربت کی زندگی کو اختیار کیا تھا۔

مولانا کاشمیری علیہ الرحمہ نے ۲۷ مئی ۱۹۳۳ء کو دیوبند میں انتقال فرمایا اور رحمتِ الٰہی میں جگہ پائی۔

[1] مکتوبات مناظر احسن گیلانی بنام حکیم محمود احمد برکاتی ۔ بصائر کراچی اپریل ۱۹۶۰ء ص ۔

موانع راہ

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس اہم مسئلے کو اپنی صوابدید اور ذمہ داری پر آگے بڑھانے کے بجائے جمعیت علمائے ہند کے سپرد کر دیا تھا۔ جمعیت نے اس مسئلے کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی مساعی کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ مولانا سجاد بہاری مرحوم نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس مراد آباد (۱۹۲۵ء) کے خطبۂ صدارت میں اس سلسلے میں جمعیت کی کوششوں کا جو تذکرہ کیا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں جمعیت علمائے ہند کا جو سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تھا اس میں قیام امارت شرعیہ فی الہند کی تجویز منظور کی گئی۔

۲۔ اسی اجلاس میں ایک قرارداد کے مطابق امیر شریعت کے اصول منضبط کیے گئے۔

۳۔ اور بعض امور کی تشریحات کے لیے ایک مجلس کا قیام عمل میں لایا گیا۔

۴۔ ایک قرارداد کے ذریعے طے پایا کہ جمعیت علماء کا ایک خصوصی اجلاس ایک ماہ کے بعد بلایا جائے جس میں مجلس تشریحات کے مسودے کی منظوری کے علاوہ امیر الہند کا انتخاب بھی کر لیا جائے۔ قرارداد کے مطابق یہ اجلاس دسمبر میں ہونے والا تھا۔

لیکن ٹھیک اسی موقع پر حکومت نے پورے ملک میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مولانا آزاد اجلاس لاہور سے فراغت کے بعد بمبئی اور دیگر مقامات سے ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے ہی تھے کہ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو انھیں

گرفتار کر لیا گیا۔ پنجاب، دہلی، دیوبند، یوپی، بہار اور بنگال کے سینکڑوں علماء گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیے گئے۔ ساتھ ہی یہ مشہور کیا گیا کہ مجلس تسوید کا جو اجلاس ہونے والا تھا اسے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ حالات بھی بظاہر اس کے مؤید تھے چنانچہ متعدد حضرات اس دھوکے میں آ گئے۔ اس کے باوجود بعض علمائے کرام اور زعمائے ملت مثلاً حکیم محمد اجمل خاں مرحوم اور مولوی ظہور احمد سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ مقررہ تاریخ کو جمع ہوئے اور اگرچہ ارکان کی رسمی تعداد جمع نہیں ہو سکی لیکن حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے حاضرین نے پوری دلسوزی اور غور و فکر کے بعد ایک مسودہ مرتب کر لیا لیکن چونکہ جمعیت و خلافت کے اکابر اور دیگر زعما گرفتار تھے اس لیے مجوزہ خصوصی اجلاس جمعیت کے انعقاد کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔ اس لیے امیر الہند کے انتخاب کی نوبت نہیں آ سکی۔ مولانا محمد سجاد بہاری لکھتے ہیں:

"جس ہفتے میں اجلاس خصوصی تھا، وہی وقت حکومت کے جبر و استبداد کے کامل مظاہرے اور قوم کے دلیرانہ مقابلے کا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علماء بھی گرفتار ہوئے اور شاید دشمنانِ اسلام کی طرف سے جا بجا مختلف عنوانات سے یہ مشہور کیا گیا کہ اجلاس ملتوی ہو گیا۔ یہ بات دل کو بھی لگتی ہوئی تھی کیونکہ خاص خاص مراکز میں گرفتاریاں عام تھیں۔ جن اراکین کے کانوں تک اس التوا کی غلط آواز پہنچی، انہوں نے قرائن پر قیاس کر کے صحیح سمجھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتنے

ارکان نہ پہنچ سکے جن کی موجودگی میں اجلاس منعقد ہو سکتا۔
مگر پھر بھی بعض حضرات علمائے اکابر اور بعض ارکان زعمائے ہند
پہنچ گئے تھے مثلاً مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب، مولوی
ظہور احمد صاحب سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ وغیرہ۔ آخر
ان حضرات کا باہمی مشورہ ہوا اور اس مجلس نے جو ترتیب۔ مسودہ
کے لیے مرتب ہوئی تھی، مسودہ مرتب کیا۔" ؎

لیکن اس وقت چونکہ جمعیت علمائے ہند کی مجلس منتظمہ کے بیشتر اراکین گرفتار تھے اس لیے مجلس منتظمہ کو اس مسودے پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا جو امارت شرعیہ کے بعض امور کی تشریح کے سلسلے میں مرتب کیا گیا تھا اور اس وجہ سے کل ہند پیمانے پر امارت شرعیہ کے قیام یا امیر الہند کے انتخاب کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ اس لیے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس اجمیر (مورخہ ۲ تا ۸ رجب ۱۳۴۰ھ مطابق مارچ ۱۹۲۲ء) میں اس مسئلے پر غور و فکر کے بعد ایک قرارداد میں صوبائی جمعیتوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ صوبوں میں امارت شرعیہ کا نظام قائم کر لیں۔ یہ اجلاس مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ قرارداد کے الفاظ یہ ہیں:

"جمعیت علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ لاہور نے طے کر دیا ہے
کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تنظیم و اقامت محاکم شرعیہ و
بیت المال کے لیے امیر الہند کا انتخاب کیا جائے۔ چونکہ

؎ تاریخ امارت ص ۵۴، ۵۵

امیر الہند کا انتخاب بظاہر اس وقت تک مشکل ہے جب تک
صوبہ وار امرا منتخب نہ ہو جائیں لہٰذا جمعیت علمائے ہند کا یہ
جلسہ تجویز کرتا ہے کہ جلد امرا صوبہ کا انتخاب عمل میں آنے اور
ہر صوبے کی جمعیت کو توجہ دلاتا ہے کہ جلد از جلد اس غرض کے لیے
جمعیت صوبے کے عام اجلاس کر کے اپنے صوبے کے واسطے
امیر شریعت منتخب کرے۔ انتخاب امیر سے قبل اس کے
فرائض و اختیارات اور قواعد مرتب کر کے جمعیت علمائے ہند
سے منظور کرا لیے جائیں۔"[1]

لیکن چونکہ صوبوں کے امراد نظمائے جمعیت بھی اس زمانے میں گرفتار تھے اس لیے اس قرارداد پر عمل نہیں کیا جا سکا البتہ علمائے پنجاب نے ان حالات میں بھی ایک اجلاس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت منتخب کر لیا، اور ضروری قواعد و ضوابط مرتب کر کے اپنے دینی و ملی کاموں میں ایک مرکزیت پیدا کر لی اور افتراق و تشتت کی زندگی سے بڑی حد تک نجات حاصل کر لی۔ صوبہ بہار میں بجون ۱۹۲۱ء ہی میں نظام شرعی کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ ان دونوں صوبوں کے سوا کسی اور صوبے میں امارت شرعیہ کا نظام قائم نہیں ہو سکا۔

فروری ۱۹۲۲ء میں بمقام دہلی مجلس منتظمہ کے اجلاس میں فرائض و اختیارات امیر شریعت اور امارت شرعیہ فی الہند کے نظام کو چھپوا کر تمام ارکان مجلس منتظمہ

---

[1] تاریخ امارت ص ۵۵

جمعیت علمائے ہند اور دیگر اہل الرائے کی خدمت میں بھیجنے کی تجویز منظور کی گئی۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق عمل کیا گیا۔ جمعیت علمائے ہند کی یہ وہ مساعی جمیلہ ہیں جو اس نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریک کے مطابق نظم جماعت کے قیام کے لیے انجام دیں۔

آزادی کے بعد نظم جماعت کی ضرورت

نظم جماعت یا امارت شرعیہ فی الہند کے قیام کے سلسلے میں جمعیت علمائے ہند کا کردار نہایت شاندار رہا ہے۔ اگرچہ جمعیت قیام نظم امارت کے مقصد میں کل ہند پیمانے پر کامیاب نہیں ہو سکی لیکن وہ اس کی ضرورت و اہمیت اور اس کے قیام کی کوشش سے کبھی غافل نہیں رہی۔ اس کے اجمیر، دہلی، مرادآباد وغیرہ کے سالانہ اجلاس کے مسائل میں یہ مسئلہ سرفہرست رہا ہے حتیٰ کہ تقسیم ملک کے بعد جمعیت و دیوبند کے اکابر نے اس مسئلے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم نے حکیم محمود احمد صاحب برکاتی کے نام ۱۲ر مئی ۱۹۵۱ء کے خط میں لکھا ہے:

> "زوال حکومت کے بعد والی امارت کی ضرورت اب بھی باقی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اتفاقاً مولانا ابوالکلام کی شکل میں ایک ایسی ہستی مسلمانوں میں موجود ہے جو اس منصب کے لیے موزوں ترین شخصیت ہو سکتی ہے۔" [1]

---

[1] بصائر، کراچی اپریل ۱۹۶۷ء ص ۵۵

لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمعیت علماء کی راہ میں مشکلات بھی نہایت شدید تھیں اسے ہر دور جس تلازم حوادث سے گزرنا اور جن حالات و شدائد سے دوچار رہنا پڑتا تھا، اس کا ہم دور افتادگان اور سبک ساران ساحل اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ مجبوراً جمعیت کو بھی صرف ان مقاصد کار پر اکتفا کر لینا پڑا جو جمعیت کے دائرہ کار کے اندر رہ کر انجام دیے جا سکتے تھے۔

جماعتی زندگی میں اضمحلال

جنوری ۱۹۲۳ء میں جب مولانا ؒ ایک سال کی قید سے رہا ہوئے تو اس مسئلے کی طرف پھر توجہ کی لیکن تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کی سرگرمیاں جوں جوں سرد پڑتی گئیں، اختلافات رونما ہونے لگے۔ معمولی معمولی باتوں نے شدید نزاع کی صورت اختیار کر لی اور روز بروز مسلمانوں کے اندرونی اختلافات بڑھتے ہی گئے۔ مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں دن بہ دن افسردگی، بے دلی، بدنظمی اور انتشار بڑھتا گیا۔ اس صورت حال کا مولانا کو شدید احساس تھا۔ تنظیم جماعت کے کام میں مشکلات بڑھتی جا رہی تھیں لیکن مولانا جماعتی زندگی کے قیام کی ضرورت سے غافل نہیں تھے۔ وہ برابر کام کو آگے بڑھا رہے تھے اور اصحابِ علم کو اس طرف متوجہ کر رہے تھے۔

صدائے دردانگیز

اپریل ۱۹۲۶ء میں منعقد ہونے والے مرکزی خلافت کمیٹی کے ایک جلسے کی تحریک کے سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”ملک کی مایوسی اور بدنظمی انتہائی درجے تک پہنچ چکی ہے اور

ان تمام لوگوں کے لیے جو صورت حال کا احساس رکھتے ہیں اور اپنی ذمہ داریوں سے بے خبر نہیں ہیں، ایک فیصلہ کن سوال پیش آگیا ہے۔ ضروری ہے کہ موجودہ معلق اور منتظر حالت ختم کر دی جائے اور ایک آخری فیصلہ ہو جائے یا تو ہمیں چاہیے کہ جلد از جلد سعی و عمل کا قدم اٹھائیں اور مسلمانان ہند کی جماعتی زندگی کو ایک سخت تاریک مستقبل سے بچالیں یا پھر ایک مدت دراز کے لیے ان تمام قومی امیدوں سے دستبردار ہو جائیں جن کے رکھنے اور پرورش کرنے کے ہم آج تک مدعی رہے ہیں۔" [1]

مسئلہ حجاز اور خلافت کمیٹی میں اختلاف

مولانا آزاد نے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو ایک جماعتی نظم کے تحت زندگی بسر کرنے کی دعوت دی لیکن ۱۹۲۰ء کی حرکت کے بعد جو ردِ عمل ظہور میں آیا، اس سے جماعتی قوتی کا نظم اور دماغی انضمام اتنا بھی باقی نہیں رہا جو اس سے پہلے تھا۔ خود خلافت کمیٹی جس کے مولانا اس وقت صدر تھے، دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک سلطان ابن سعود کے ملک الحجاز بن جانے کا حامی یا سلطان کے اعلان ملوکیت کے بعد اپنے سامنے کوئی راہِ عمل نہ پا کر اور بربنائے مصلحت خاموشی اور صورت حال کو قبول کر لینے کو بہتر

---

[1] مکاتیب ابوالکلام آزاد، مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری ص ۱۷۱

سمجھتا تھا۔ دوسرا فریق اس صورت حال سے نمٹنے کی کوئی راہ نہ پاکر سلطان کی مخالفت پر کمربستہ تھا۔ مولانا ظفر علی خاں فریق اوّل کے سرخیل تھے اور دوسرا فریق مولانا محمد علی جوہر کی رہنمائی میں ان کی مخالفت پر کمربستہ تھا۔ زمیندار اور ہمدرد کی جنگ (۱۹۲۶ء) میں وجہ نزاع یہی مسئلہ تھا۔ یہ جنگ شروع اور آخر سال میں دو مرتبہ زور و شور کے ساتھ چھڑی اور کئی کئی مہینے تک جاری رہی۔ مولانا آزاد نے اسے ختم کرانے میں کافی حصہ لیا۔

بائیس برس کی شکوہ سنجی

یہ انتشار و تشتت ۱۹۲۶ء میں تھا۔ اس کے بعد بھی جو دن آیا مسلمانوں کے جماعتی قویٰ میں اضمحلال پیدا ہوتا گیا اور ثابت ہو گیا کہ مسلمان ذاتی اگروہی اور فرقہ واری خیالات سے بلند ہو کر ایک اجتماعی نصب العین اور عظیم تر مصالح و مقاصد ملّی کے لیے کام نہیں کر سکتے۔ اس طرح اگرچہ تنظیم جماعت کا تصور شرمندۂ عمل نہیں ہو سکا لیکن یہ خیال مولانا کے ذہن سے کبھی نہیں نکلا۔ وہ ہمیشہ اس کے شکوہ سنج اور ماتم گسار رہے۔ اپنے ہم نام اور خلیفہ مجاز مولانا محی الدین احمد قصوری مرحوم کے نام جماعت والتزام جماعت سے متعلق ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں[1]:

"کاش کہ ہندوستان میں مسلمان کوئی ایسا نظام قائم کرتے

---

[1] تبرکات آزاد میں اس خط کی جگہ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان میں ہے لیکن اس میں مولانا نے ۲۲ برس کی شکوہ سنجی کا ذکر کیا ہے اور ۱۹۱۳ء میں جب کہ مولانا نے یہ دعوت دی تھی، ۲۲ جمع کر دیئے جائیں تو ۱۹۳۶ء ہوتے ہیں اس لیے میرا خیال ہے کہ یہ خط ۱۹۳۶ء کا لکھا ہے۔

جو ناقص معنوں ہی میں حقیقت جماعت کا رنگ پیدا کر سکتا۔
آپ کی یہ ستم ظریفی قابلِ داد ہے کہ جماعت و التزامِ جماعت کا شکوہ کیا بھی تو اسی نامراد سے جو بائیس برس سے اسی حقیقت کے لیے شکوہ سنج رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ آپ میری ہی تحریروں کا حوالہ دیتے ہیں!

این سخن را چہ جواب است تو ہم می دانی!" [1]

مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار

یہ صدائے دردانگیز مختلف موقعوں پر اور مختلف صحبتوں میں بلند ہوتی رہی۔
۱۹۳۴ء کے اواخر میں جب مولانا نے بالی گنج کلکتہ کی جامع مسجد میں مسلمانان کلکتہ کے اصرار سے مجبور ہو کر نماز جمعہ کی امامت قبول فرمائی اور خطبات کا سلسلہ شروع کیا تو ان تمام خطبات میں جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا، وہ جماعتی زندگی اور اس کے اعمال و امتیازات اور خصائص ہیں۔ مولانا نے ان کے ترک کر دینے کو مسلمانوں کے تنزل کا سبب اور ان کے اختیار کر لینے کو ان کے کھوئے ہوئے وقار کی واپسی کا علاج بتایا ہے۔ دسمبر ۱۹۳۵ء میں خطبہ عید الفطر میں مولانا نے فرمایا:

"احکام شریعت پر کامل ۲۵ سال تک میں نے پوری طرح غور و خوض کیا اور اس ۲۵ سال کے عرصے میں شاید ہی کوئی دن

---

[1] تبرکاتِ آزاد، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، لاہور ۱۹۵۹ء ص ۴۰

ایسا ہو جس کی کوئی صبح، کوئی شام اس فکر سے خالی گزری ہو

اور بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ واضع شریعت کا منشا یہ ہے

کہ اس کے احکام ایک جماعتی نظام کے ماتحت اجرا پائیں۔

لیکن مسلمانوں نے اس جماعتی نظام کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔"[1]

اس خطبے میں کس حسرت کے ساتھ فرماتے ہیں:

"کاش مجھ میں ایسی قوت ہوتی یا وہ شے موجود ہوتی جس کی مدد سے میں تمہارے مقفل قلوب کے پٹ کھول سکتا تاکہ میری آواز تمہارے کانوں میں نہیں بلکہ تمہارے دل میں سما سکتی اور تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتے۔"[2]

اس کے بعد بھی مولانا نے چھوٹے سے چھوٹے پیمانے پر اور قصبے اور شہر کی سطح ہی پر مسلمانوں کو نظم جماعت قائم کر لینے کی طرف توجہ دلائی کہ یہ بھی کسی نہ کسی حد تک مفید تھا لیکن مسلمانوں کی غفلت اور انتشار ایسا نہ تھا کہ اس دردمند ملت کی آواز پر توجہ دی جاتی۔ مسلمانوں نے ان کی دعوت کا جواب اعراض وانکار سے دیا۔ مولانا اپنا فرض ادا کر کے اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ لیکن مولانا کی دعوت وقتی حالات ومصالح پر مبنی نہیں تھی۔ اس کی بنیاد قرآن حکیم کی تعلیمات حقہ اور معارف وحقائق نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے اسرار وحکم

---

[1] خطبات جمعات وعیدین مرتبہ سیف صدیقی ص ۷۰

[2] ایضاً ص ۷۱

پرنمی اس لیے اس کی ضرورت لازمی اور اس کی اہمیت دائمی ہے۔ مولانا کو ہم سے رخصت ہوئے تیرہ[1] سال گزر چکے ہیں لیکن یہ صدائے دردانگیز اب بھی فضا میں گونج رہی ہے۔ کاش مسلمان خصوصًا اصحابِ علم اس پر توجہ فرمائیں۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

---

[1] اب اس میں چار سال کا اضافہ اور کردینا چاہیے۔

باب چہارم

اسبابِ ناکامی

اس سلسلہ بحث کا ایک نہایت نازک پہلو اس تحریک کی ناکامی کے اسباب کی بحث ہے۔ حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کی تحریک جہاد کی طرح یہ تحریک بھی ناکام ہو گئی۔ یہاں ناکامی سے میری مراد عام معنوں میں ناکامی ہے نہ کہ دعوتِ حق کی ناکامی! دعوت و کلمہ حق کے لیے دنیا میں ناکامی کی رسوائی نہیں اور نہ داعی الی الحق کے لیے نامرادی کی موت ہے۔ دعوت حق اپنی صداقت کے لیے کسی عملی شکل کی محتاج نہیں اور نہ کسی داعی الی الحق کا مراد پا لینا اس کی صداقت شعاری اور حق کوشی کے ثبوت کیلئے ضروری ہے کسی بات کی صداقت کے لیے اس کا حق ہونا ضروری ہے اور داعی کی آزمائش اقدام و سعی میں ہے ان ارواح مقدسہ کی کامیابی کے لیے یہ بات بس کرتی ہے کہ انھوں نے خالصاً لوجہ اللہ مسلمانوں کے دینی و ملی مفاد کے تحفظ و بقا کے لیے قدم اٹھایا اور اپنے پورے وسائل کو بروئے کار لاکر، اپنی پوری صلاحیتوں کو استعمال کر کے، اپنی جان اور اپنے مالوں کی پروا نہ کر کے، زندگی کی عشرتوں اور راحتوں کو ٹھکرا کر، پورے اخلاص کے ساتھ، پوری مستعدی اور جانفشانی کے ساتھ، انسانی سعی و جہد کے آخری مراحل تک جا کر اپنی جانیں جان آفریں کے سپرد کر دیں۔

اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے جس کی ان سے توقع کی جائے؟ جنھوں نے مقیم زندگی کی آسائشوں کے بجائے غربت کی تکالیف کو اختیار کر لیا ہو۔ گھر کی عشرتوں کے بجائے میدانِ جہاد کی مشقتوں کو اور نرم و گداز بستروں کی جگہ پتھریلے فرش میں اپنی راحت دل و جاں کا سامان ڈھونڈھا ہو، جس کی نگاہوں کو میدانِ

جہاد کا خونیں منظر عارض گل کی دلفریبیوں اور رعنائیوں سے زیادہ محبوب ہو، جنھوں نے صرف رضائے الٰہی کے لیے دیبا و حریر کی پوشاکوں پر میلی کچیلی مگر خونِ شہادت کے چھینٹوں سے رنگین قباؤں کو ترجیح دی ہو، اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے جس کا ان سے مطالبہ کیا جائے، جن کے لیے پہلے ہی بشارت سنا دی گئی ہو کہ:

ان اللّٰه اشترىٰ من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهم الجنّة ، يقاتلون فى سبيل اللّٰه فيقتلون ويقتلون وعدًا عليه حقًّا فى التوراة والانجيل والقراٰن۔ ومن اوفى بعهده من اللّٰه فاستبشروا ببيعكم الذى بايعتم به وذالك هو الفوز العظيم۔

(۹ : ۱۱۱)

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لیں اور ان کا مال بھی اور اس قیمت پر خرید لیں کہ ان کے لیے بہشت (کی جاودانی زندگی) ہو۔ وہ (کسی دنیوی مقصد کی راہ میں نہیں بلکہ) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہو چکا (یعنی اس نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا) تورات، انجیل، قرآن (تینوں کتابوں) میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو؟

پس (مسلمانو!) اپنے اس سودے پر
جو تم نے اللہ سے چکایا، خوشیاں مناؤ
اور یہی ہے جو بڑی سے بڑی فیروزمندی ہے۔

ان کے لیے اس سے بڑی اور کامیابی کیا ہو گی کہ وہ اپنے عہد میں پورے اترے

اور رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کا مقام محبوبیت حاصل کر لیا۔

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہ کن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز — اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

ناکامی کا داغ ان کے لیے کیوں ہوتا؟ یہ ذلت تو ان کے لیے ہے جن کی نیتیں اخلاص سے خالی ہیں، جن کے قلوب عزم امور کی حلاوت سے ناآشنا ہیں اور جو اپنے پائے اقدام وسعی فی سبیل اللہ کو توڑ بیٹھے ہیں۔

البتہ اس دعوت حق وخیر کے افادہ وفیضان سے مسلمان ضرور محروم رہ گئے اور ماتم ان اصحاب قیل وقال کی بے بصیرتی پر ہے جو اس راہ کی رکاوٹ بن گئے۔ اگرچہ آج کسی جماعت یا اشخاص کا تعین وتشخص تحریک کے لیے ہرگز سود مند نہیں ہو سکتا لیکن تاریخ کا ایک ناخوشگوار مگر ناگزیر فرض ہے جسے انجام دیے بغیر چارہ نہیں اس لیے چند اشارات کر دینا ضروری ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس لاہور (۱۹۲۱ء) کے خطبۂ صدارت میں، اس باب میں بعض حضرات کے اختلاف وجدل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اس کے بعد (یعنی صوبہ بہار میں نظام امارت شرعیہ کے قیام

کے بعد) ارادہ تھا کہ فوراً دوسرے صوبوں میں بھی کام شروع کر دیا جائے گا۔ لیکن یکایک بعض حضرات نے اس مسئلے کی نسبت اخبارات میں قیل وقال شروع کر دی اور بلا ضرورت علمائے ملت کا ایک عملی کام انتظارِ عوام میں بصورت اختلاف

وجدل نمایاں کر دیا گیا۔ یہ چیز مجھ کو اس کام سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں روک سکتی تھی۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ اب یہ مسئلہ منظر عام پر آچکا ہے اور جمعیت علماء اس کا آخری اور قطعی فیصلہ کر سکتی ہے، تو یہی مناسب معلوم ہوا کہ اسے جمعیت کے حوالے کر کے بالفعل خود سبکدوش ہو جاؤں۔"[1]

نظام شیخ الاسلام، بدایوں

میرا خیال ہے مولانا مرحوم کا اشارہ اس تحریک کی جانب ہے جو اسی زمانے میں بدایوں سے نظام شیخ الاسلام کے عنوان سے اٹھی تھی، کانپور سے اس کی پُرجوش تائید کی گئی تھی، لکھنؤ سے اس کی حمایت و معاونت کا اطمینان دلایا گیا تھا اور بدایوں یا لکھنؤ میں اس کے مرکز کے قیام کے ساتھ پنجاب، بہار اور یوپی کے صوبوں میں تنظیم کے قیام کے منصوبے بنائے گئے تھے اور بلاشبہ جذبات کی کمی نہ تھی لیکن اس مسئلے کی واقعی اہمیت و حقیقت اور مشکلات راہ و ضروریات سفر کا اندازہ شناس کوئی بھی نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قافلے نے ابھی منزل مقصود کی طرف سفر شروع بھی نہ کیا تھا کہ اس کے اعضا و ارکان منتشر و متفرق

---

[1] خطبۂ صدارت تحریری، ص ۵۲

ہونا شروع ہو گئے۔[۱]

ایک اور جگہ مولانا نے اس تحریک کی ناکامی کا سبب علمائے کے جمود اور وقت کی عدم مساعدت و استعداد کو قرار دیا ہے۔ مولانا محی الدین قصوری مرحوم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں اپنے پندرہ سال کے طلب و عشق کے بعد وقت کے عدم مساعدت و استعداد کا اعتراف کرتا ہوں تو آپ کو بھی میرا ساتھ دینا چاہیے .... میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ موجودہ طبقہ علمائے سے ...... میں قطعاً مایوس ہوں اور اس کو قوانین اجتماع کے بالکل خلاف سمجھتا ہوں کہ ان کے جمود میں کسی طرح کا تقلب و تحول پیدا ہو۔ راہِ عمل صرف ایک ہی ہے یعنی موجودہ پختہ دماغوں سے صرف نظر کر کے ایک نئی مخلوقاتِ دماغ و فکر کی پیدا کرنا۔"[۲]

جماعت اسلامی کے مشہور صحافی مولانا نصر اللہ خاں عزیز نے اپنے ایک سلسلہ مضمون

---

[۱] نقوش، لاہور (خطوط نمبر حصہ دوم) میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے نام مولانا عبد اللہ اور آزاد سبحانی کے خطوط نمبر ۲ و ۳ میں یہی مسئلہ، اس کا نظام و مرکز اور دیگر انتظامات زیر بحث ہیں۔ مولانا محمد عبد القدیر بدایونی کے خطوط نمبر ۶، ۸، ۱۰، ۱۲ میں بھی اسی مسئلے کی طرف اشارات ہیں۔ ماہنامہ شمس العلوم بدایوں میں نظام شیخ الاسلام پر ایک مضمون شائع ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ بعض حضرات کس طرح مسلمانوں کی زندگی کے ایک اہم مسئلے میں اختلاف پیدا کر کے نظام شرعی کے قیام میں رکاوٹ بن گئے۔

[۲] تبرکات آزاد ص [illegible]

" زندگانی کی گزرگاہوں میں " اس تحریک کی ناکامی پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے :

" اس اجلاس تک مولانا کی کوشش یہ رہی کہ مسلمانوں کو ان کی اپنی لیڈرشپ میں منظم کیا جائے۔ ان کا قافلہ اور قافلہ سالار خود مسلمانوں میں سے ہو اور انھیں اسلامی اصولوں پر منظم کر کے تحریک آزادی میں جھونکا جائے[1]۔ چنانچہ اس اجلاس میں انھوں نے ایک پروگرام پیش کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان ایک امیر کے ہاتھ پر جمع ہو جائیں۔ خلافتی مسلمانوں کی اکثریت خود مولانا کو امارت کا منصب سونپنے کے لیے

---

[1] مسلمانوں کی تنظیم کا مقصد صرف یہ قرار دینا کہ " انھیں منظم کر کے تحریک آزادی میں جھونکا جائے" کسی طرح درست نہیں۔ البتہ اس تنظیم کا یہ ایک ضمنی اور وقتی مقصد ضرور تھا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی کہ " اس اجلاس (۱۹۲۱ء) تک مولانا کی یہ کوشش رہی" درست نہیں۔ مولانا اس کے بعد تقریباً بیس برس تک اس فکر سے غافل نہیں ہوئے۔ ان کی تو یہ خواہش رہی کہ ناقص معنوں ہی میں سہی ایک مرتبہ یہ نظام قائم ہو جائے تو کسی نہ کسی درجے میں یہ بھی مفید ہوگا۔ مگر بقول سید صاحب مرحوم " اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ حضرات نے اس کو کسی طرح چلنے نہ دیا"۔ مولانا نصراللہ خاں عزیز کے دونوں خیالوں کی تردید ان بے شمار حقائق سے بھی ہو جاتی ہے جو اس کتاب میں زیرِ بحث آئے ہیں۔ " حنفی علماء کے ایک متشدد گروہ" سے اشارہ غالباً علمائے بریلی و بدایوں کی جانب ہے۔

تیار تھی لیکن حنفی علماء کا ایک متشدد گروہ ان کی وہابیت کو

گوارا کرنے کے لیے مطلق آمادہ نہ ہوا اور امارت شرعیہ کی

اسکیم ناکام ہوگئی"۔ ؎۱

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاس کلکتہ کے خطبہ صدارت میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ایک خدشے کا ذکر فرمایا ہے، یہ حضرات بھی واقعی رکاوٹ بن گئے۔ سید علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

"تعلیم یافتہ حضرات کو شبہ ہے کہ علما اس پردے میں اپنی کھوئی ہوئی وجاہت کو دوبارہ قائم کرنا چاہتے ہیں"۔ ؎۲

ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں:

"۱۹۱۸ء میں معارف میں اس تحریک کو اٹھایا گیا اور اصلاحات کے سلسلے میں اس کو پیش کیا گیا۔ پھر ۱۹۲۰ء میں یورپ سے واپسی کے بعد چاہا کہ اس کو تمام ہندوستان کا مسئلہ بنایا جائے مگر اس عہد کے جدید تعلیم کے علم برداروں نے اس کو کسی طرح چلنے نہ دیا"۔ ؎۳

جہاں تک اصحاب قیل و قال کے اعتراضات و شکوک اور جدید تعلیم یافتہ

؎۱ ہفت روزہ ایشیا، لاہور، ۱۷۔ دسمبر ۱۹۵۹ء

؎۲ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۲۶ء ص ۱۶۹

؎۳ ایضاً مارچ ۱۹۴۱ء بحوالہ یادِ رفتگاں ص ۲۴۲

حضرات کے بعض خدشات کا تعلق ہے مولانا سجاد بہاری اور مولانا سید سلیمان ندوی نے بہت کوشش کی کہ تشکوک اور خدشات رفع ہوں۔ مولانا آزاد کی تحریروں اور خطبوں میں بھی ایک مذبذب اور متشکک ذہن کے لیے بہت سے دلائل موجود ہیں لیکن ان اصحاب قیل وقال کے رویتے نے صاف بتدیا کہ دلائل کی کوئی صف بندی ان کے دلوں کو اطمینان سے آشنا نہیں کر سکتی۔

مولانا آزاد کی ذمہ داری

اس عظیم الشان تحریک کی ناکامی کے ان اسباب کے ساتھ ایک ایسی رائے بھی ہے جس کے مطابق اس تحریک کی ناکامی کی تمام تر ذمہ داری کسی اور پر نہیں مولانا آزاد پر عائد ہوتی ہے۔ یہ رائے مولانا آزاد کے کسی مخالف کی نہیں مولوی محمد علی قصوری کی ہے، مولوی صاحب موصوف کے زندگی بھر مولانا آزاد سے بہت قریبی تعلقات رہے۔ ان کا پورا خاندان بھی مولانا سے اپنے تعلقات میں پورے ملک میں خصوصاً پنجاب میں ایک امتیاز رکھتا تھا۔ وہ مولانا ہی کے مسلک کے پیرو تھے[1]۔ اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں:

> "ہندوستان میں ہم نے مسلمانوں کی مذہبی تنظیم کی تحریک اٹھائی مگر اس میں غلطی یہ کی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند بناکر تمام تحریک ان کے بل بوتے پر کھڑی کی لیکن عین وقت پر

---

[1] مولوی محمد علی قصوری مولانا عبدالقادر قصوری علیہ الرحمہ کے منجھلے صاحبزادے تھے، ان کے بڑے بھائی مولوی محی الدین قصوری تھے، چھوٹے بھائی پاکستان کے مشہور قانون دان جناب محمود علی قصوری بیرسٹرایٹ لاء ہیں۔

مولانا آزاد کی بزدلی نے تمام کھیل بگاڑ دیا اور وُہ سارے کا سارا محل جس کی تعمیر پر لاکھوں روپیہ صرف ہُوا تھا اور سینکڑوں مسلمانوں نے اسے اپنے خُون سے سینچا تھا، مولانا کی گریز پائی کی وجہ سے آن کی آن میں دھڑام سے نیچے آن گرا۔" ؎

جہاں تک مولوی محمد علی مرحوم کے اخلاص اور جوشِ اسلامی کا تعلق ہے، اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا لیکن میرے نزدیک ان کی رائے کی صحت محلِ نظر ہے۔ میرے سامنے مولانا کی پوری تحریک اور راہ کی تمام مشکلات بھی ہیں اور مولوی محمد علی قصوری کی پُرعمل زندگی اور اس کے نشیب و فراز بھی ہیں میں پورے وثوق اور انشراحِ قلب کے ساتھ اس رائے پر قائم ہوں کہ مولانا آزاد کی راہ عقل و بصیرت کی راہ تھی اور مولوی محمد علی کی خواہش ایک سچے مسلمان کی خواہش تھی جس کی بنیاد جوش و جذبات پر تھی۔ میرے نزدیک جوش و جذبات کی بڑی اہمیت ہے اور میں اس کا بھی قائل ہوں کہ دل کو جو جذبات و جوش کا سرچشمہ ہے، کبھی کبھی عقل کی پاسبانی سے آزاد بھی چھوڑ دینا چاہیے لیکن عملی زندگی میں جوش و جذبات کی فراوانی سے زیادہ عقل و بصیرت کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اجتماعی زندگی کے تقاضے اور ملت کی رہنمائی کی ذمہ داریوں کو جوش و جذبات کی ترازو میں نہیں تولا جا سکتا، جذبات خواہ کتنے ہی سچے اور اعلیٰ کیوں نہ ہوں۔

؎ مشاہدات کابل و یاغستان۔ محمد علی قصوری۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی ص ۶۹

اس حقیقت پر بھی نظر رہنی چاہیے کہ مولوی محمد علی قصوری کی اصل خوبی عمل و استقامت تھی اور یہ ان کی زیادہ سے زیادہ عزت کے لیے بس کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص عمل و استقامت میں اپنے تلووں کے لیے کانٹوں اور ہتھیلی کے لیے انگاروں کا انتخاب کر لے وہ صحتِ فکر و اصابت رائے کے لحاظ سے بھی غیر معمولی شخصیت کا مالک ہو۔

حصّہ دوم

امیر نظم جماعت

اور

خلفا و مریدین

تحریک کے امیر کی حیثیت سے حضرت شیخ الہندؒ کو پیش کیا گیا ہے بلاشبہ تحریک کے داعی کی حیثیت اور تحریک کی بنیادی اور اہم شخصیت مولانا ابو الکلام آزاد کی تھی لیکن ہندوستان کی امارت شرعیہ کی ذمہ داری کے لیے مولانا آزاد کی نگاہِ انتخاب حضرت ہی پر پڑی تھی اور حضرت نے اسے قبول فرما لیا تھا۔ اس لیے امام الہند کی حیثیت میرے نزدیک مولانا محمود حسن علیہ الرحمہ کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں اپنی نازک صحت کی بنا پر اپنے تئیں حضرت نے اس ذمہ داری سے الگ کر لیا تھا اور مولانا آزاد پر اپنا اعتماد ظاہر فرما دیا تھا۔

باب پنجم

امیر نظم جماعت

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی

حضرت شیخ الہند ۱۲۶۸ھ میں بریلی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد مولانا ذوالفقار علی بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے، مولانا ذوالفقار علی ان نفوس قدسیہ میں سے تھے جو دارالعلوم دیوبند کے قیام میں ساعی اور اس کی پہلی مجلس شوریٰ کے ایک ممتاز رکن تھے۔

تعلیم

حضرت شیخ الہند نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی۔ ابتدائی کتابوں سے آگے بڑھے تو انھیں مولانا محمد قاسم نانوتوی کے سپرد کر دیا گیا مولانا کا قیام اس وقت میرٹھ میں تھا اور منشی ممتاز علی کے مطبع میں مصحح کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو حضرت شیخ الہند دیوبند تشریف لائے اور دارالعلوم میں داخل ہو گئے، اور مولانا محمودؒ عرف ملا محمود، مولانا محمد یعقوبؒ ابن مولانا مملوک العلی اور سید احمد دہلوی سے علوم کی تکمیل کے بعد ۱۸۷۳ء میں تحصیل علوم سے فارغ ہوئے

سلسلۂ تدریس

تدریس کا سلسلہ اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب آپ آخری کتابیں پڑھ رہے تھے، فراغت کے بعد ۱۸۷۴ء میں معاون مدرس کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا، لیکن ایک

سال تک انھیں اس خدمت کی کوئی تنخواہ نہیں ملی اس سے اگلے سال انھیں مدرس چہارم کی حیثیت سے متعین کیا گیا اور پندرہ روپے مشاہرہ مقرر ہوا۔

دارالعلوم کا عہدہ صدارت

۱۳۱۸ھ میں آپ عہدۂ صدر مدرسی پر فائز ہوئے مولانا قاری محمد طیب صاحب کے یہ الفاظ ذہن نشین رہیں۔

"دارالعلوم کا عہدۂ صدارت تدریس محض مدرسی کا عہدہ نہیں بلکہ مقتدائی کا عہدہ رہا ہے جس پر آنے والے کے علمی اثرات سے قلوب متاثر و مستفید رہتے آئے ہیں" [۵۱]

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ "یہ مقتدائی" فقہ کے کسی خاص مکتبۂ فکر یا تصوف کے کسی خاص سلسلۂ رشد و ہدایت کی نہ تھی، نہ کسی خانقاہ کی تولیت یا کسی صاحب سلسلہ کی خلافت سے حاصل ہوئی تھی۔ دارالعلوم کے عہدۂ صدر مدرسی کو کسی کلیہ کی پرنسپل شپ یا کسی جامعہ کی وائس چانسلر شپ سے بھی مماثل قرار نہیں دینا چاہیے کہ محض تعلیم و تدریس میں رہنمائی و نگرانی اور چند انتظامی امور کی بجاآوری سے اس کا تعلق ہو۔

تحریک آزادی کا مرکز

دارالعلوم کی تحریک اور اس کے مقاصد و طریقۂ کار میں تو الگ ایک باب کی ضرورت ہوگی یہاں اتنی بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ دارالعلوم نہ محض ایک درسگاہ تھی نہ کوئی خانقاہ، دارالعلوم اسلام کے احیاء اور مسلمانوں کی زندگی کے قیام اور

---

[۵۱] نئی دنیا، دہلی (عظیم مدنی نمبر ۱۹۸۶ء) ص ۲۷

سیاسی آزادی کی تحریک کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا دارالعلوم بیک وقت دینی وسیاسی تعلیم گاہ اور تربیت کا مرکز تھا۔ حضرت شیخ الہند رح نے یہاں مولانا محمد قاسم نانوتوی سے دین اور سیاست کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور تربیت بھی پائی تھی اب اس تحریک کے مجاہدوں کی تعلیم و تربیت دینی وسیاسی کی ذمہ داری آپ پر تھی۔

ثمرۃ التربیت کا قیام اسی مقصد کے پیش نظر آپ نے فضلاء اور بہی خواہان تحریک دارالعلوم کی ایک جماعت "ثمرۃ التربیت" کے نام سے ۱۸۷۸ء میں قائم کی تھی اور اس طرح علوم دینی کی تدریس اور سیاسی تعلیم و تربیت نہایت ہی خوش اسلوبی اور کامل درجہ توازن کے ساتھ ہو رہی تھی. مولانا محمد میاں نے اس کے ثمرات کے متعلق لکھا ہے:

"آپ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم رح کے تلمیذ خاص اور ہم راز رفیق تھے۔ لہذا آپ تحریک دارالعلوم دیوبند کے اصلی منشا سے بخوبی واقف تھے چنانچہ آپ کی تدریس خشک اور جامد زہد و تقویٰ کی تلقین نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ آپ کی تربیت نے ایسے حضرات کو پیدا کیا جو آسمان سیاست کے روشن ستارے مانے گئے" [۵۱]

ارشد تلامذہ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبیداللہ سندھی، مفتی کفایت اللہ مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا احمد علی لاہوری امیر انجمن خدام الدین لاہور، مولانا محمد صادق سندھی بانی مدرسہ مظہر العلوم کراچی،

---

[۵۱] علمائے حق (حصہ اول) ص ۱۱۲ مولانا سید محمد میاں کتب خانہ فخریہ، مراد آباد

مولانا عزیر گل (حضرت شیخ الہند کے رفیق اسارت مالٹا) مولانا عبدالرحیم پوپلزئی (آخر الذکر دونوں علمائے کرام شمال مغربی سرحدی صوبے سے تعلق رکھتے تھے) وغیرہ حضرات تو آپ کے شاگرد اور تحریک آزادی کے عظیم رہنماؤں میں سے ہیں۔

مرکز کشش ثقل سیاسی

لیکن اس عہد کے اکابر سیاست دانوں میں سے کون ہے جو شیخ الہند کے افکار سیاسی سے مستفید نہ ہوا ہو اور جس نے آپ کے عمل و سیرت سے عزیمت و استقامت کا سبق نہ سیکھا ہو۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری تو آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی وغیرہ کون ہے جو وقت کے اس سیاسی سورج کے نظام کشش سے آزاد ہو اور اپنا الگ کوئی مرکز ثقل رکھتا ہو۔

علمائے دہلی و یوپی

اگرچہ علوم دینی میں دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں بعض دوسرے مراکز نور بھی تھے اور ان کے اپنے الگ الگ نظام قمری تھے لیکن سیاسی روشنی وہ اسی چشمۂ نور سے حاصل کرتے تھے۔ سیاست میں انھیں پیشوائی و مقتدائی کا جو مقام حاصل تھا وہ بذاتہٖ نہ تھا بلکہ لغیرہ تھا۔ علمائے فرنگی محل کے شیخ وقت مولانا عبدالباریؒ آپ کی بزرگی مشیخت اور سیاسی رہنمائی کے معترف و مداح تھے۔ مولانا محمد الیاسؒ جنھوں نے تبلیغی جماعت کے بانی اور امیر کی حیثیت سے عالمگیر شہرت پائی، حضرت شیخ الہند کے دست حق پرست پر بیعت جہاد

کر چکے تھے۔

علمائے پنجاب

علمائے لاہور ولدھیانہ میں سے اکثر ایک الگ فقہی مسلک رکھنے کے باوجود سیاسی میدان میں ان کے مطاع و مرشد بھی حضرت شیخ الہندؒ تھے۔

اکابر علی گڑھ

حضرت شیخ الہند کی دینی بزرگی اور سیاسی رہنمائی کا اعتراف مذہبی حلقے ہی میں نہیں کیا گیا، سیاست کے دوسرے مکتبۂ فکر یعنی علمائے علی گڑھ کے اکابر نے بھی کیا ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند کا جو عظیم الشان جلسۂ دستار بندی ہوا اس میں تحریک علی گڑھ کے اکابر بھی شریک ہوئے۔ اس جلسے میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے تعلیم یافتہ علی گڑھ کالج میں انگریزی پڑھنے جایا کریں اور علی گڑھ کے گریجویٹ دینی تعلیم کے لیے دیوبند آئیں۔ اس تجویز کو اکابر دیوبند نے بھی پسند کیا لیکن افسوس کہ اس تجویز کے مطابق علی گڑھ سے جو گریجویٹ سب سے پہلے دینی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے وہ برٹش حکومت کے سی۔ آئی۔ ڈی تھے جنہیں بعد میں حسن خدمات کے صلے میں سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی کا عہدہ حاصل ہوا۔

وقارالملک نواب مولوی مشتاق حسین

نواب وقارالملک حضرت شیخ الہندؒ کے نہایت درجہ معتقد اور ان کی سیاسی تحریک کے معترف تھے اس کے ثبوت کے لیے یہ بات کفایت کرتی ہے کہ ۱۹۱۳ء میں نظارت المعارف القرآنیہ کے نام سے جو ایک

سیاسی ادارہ حضرت شیخ الہند رح نے قائم کیا اور اپنے شاگرد رشید مولانا عبید اللہ سندھی کو اس کا ناظم بنایا تھا اس کے سرپرستوں میں حکیم محمد اجمل خاں دہلوی اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے نظارت المعارف کا مقصد پڑھے لکھے خصوصاً علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سیاسی تربیت اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ حکمت کے مطابق ہندوستان کے موقتہ حالات میں سیاسی رہنمائی کرتی تھی۔

سیاسی تعلیم و تربیت

حضرت شیخ الہند رح کے نزدیک دینی و سیاسی دونوں قسم کی تعلیم و تربیت کی ضرورت اور اہمیت تھی دینی تعلیم کے مرکز کی حیثیت سے سب سے اول دار العلوم دیوبند تھا اور دوسرے شہروں میں بہت سے چھوٹے بڑے دینی مدارس یہ خدمت انجام دے رہے تھے لیکن سیاسی تعلیم و تربیت کا انتظام اس طرح نہ تھا ملک میں کوئی سیاسی تنظیم اور جماعت موجود نہ تھی جس کی عملی جد وجہد سے مسلمانوں کی ذہنی وفکری رہنمائی اور عملی تربیت کی ضرورت کسی نہ کسی حد تک پوری ہوتی رہتی۔ اگر دار العلوم میں مصروف تعلیم طلبہ ہی کی سیاسی تعلیم و تربیت پر اکتفا کر لیا جاتا تو یہ ایک طویل المیعاد منصوبہ تھا جب کہ حالات کا تقاضہ دوسرا تھا اس لیے ایک درس گاہ کی حدود سے زیادہ وسیع حلقے میں اپنے افکار سیاسی کی اشاعت اور حلقہ تلامذہ کے علاوہ سیاسی رجحان و فکر رکھنے والے نوجوانوں کی سیاسی تعلیم و تربیت بھی حضرت شیخ الہند رح کے پیش نظر تھی۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے آپ

نے ۱۸۷۸ء میں ثمرۃ التربیت " کے نام سے ایک انجمن قائم کی اس کا تذکرہ ابھی آچکا ہے ۔

جمعیتہ الانصار کا قیام

اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں جمعیتہ الانصار کا قیام عمل میں آیا مولانا عبید اللہؒ سندھی اس کے ناظم تھے ۔ اپریل ۱۹۱۱ء میں مرادآباد میں اس کا جلسہ مولانا احمد حسن امروہوی کی صدارت میں ہوا ۔ جلسے میں مختلف مکاتب فکر کے علمائے دین اور زعمائے ملت نے شرکت فرمائی ۔ یہ جلسہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اختتام کو پہنچا اگرچہ اس کا اہتمام طالب علموں نے کیا تھا لیکن برٹش حکومت سے جمعیتہ کے مقاصد اور شیخ الہند اور ان کے تربیت یافتگان کے عزائم دلی چھپے نہیں رہ سکتے تھے رسمًا ایک تجویز میں حکومت کا شکریہ بھی ادا کیا گیا تھا لیکن جس جمعیتہ کے خطبۂ صدارت میں اس کے صدر مولانا احمد حسن امروہویؒ نے یہ کہہ دیا ہو کہ اس کے بارے میں حکومت کیونکر خوش فہم رہ سکتی تھی

> " جمعیتہ الانصار ہرگز کسی انجمن کی نقل نہیں ہے اور نہ کسی کے ذاتی مقاصد سے بحیثیت دنیاوی اس کا تعلق ہے بلکہ اس کے مقاصد وہ ضروری مقاصد ہیں جن کی آج بہت کچھ ضرورت ہے " [۵]

سیاسی جدوجہد کے لیے اس صاف صاف اعلان جہاد کے بعد " تجویز شکریہ " کی لیپا پوتی کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے اس کا اندازہ مشکل نہیں ۔ چنانچہ انگریزوں کی بدگمانی میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا ۔

---

[۵] علمائے حق (حصہ اول) ص ۱۳۴

سنہ ۱۹۱۲ء میں سیاسی تعلیم و تربیت کا مرکز دیوبند سے دہلی منتقل کر دیا گیا۔ حضرت شیخ الہند رح کے حکم سے مولانا عبید اللہ سندھی دہلی تشریف لے گئے نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے ایک مرکز قائم کیا اور اپنا کام شروع کر دیا۔ سیاسی تربیت کے لیے حضرت شیخ الہند رح کے طریق کار پر مولانا عبید اللہ سندھی رح کے ان الفاظ سے روشنی پڑتی ہے۔

"حضرت شیخ الہند رح نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاست سے واقف رہا۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند رح کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہ کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار تھا اس میں میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت

تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہندؒ کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا"۔ ۵؎

حضرت شیخ الہندؒ کا انقلابی اقدام

۱۹۱۲ء تک حضرت شیخ الہندؒ کا طریق کار وہی رہا جس کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا ہے یعنی تعلیم و تربیت دینی وسیاسی سے ایک ایسی جماعت تیار کردی جائے جو قیام شرع، ادائے فرض اسلامیہ احیاء و تجدید ملت، ملکی سیاست اور آزادی کی جدوجہد میں اپنی ذمہ داریوں کا شدید احساس اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت رکھتی ہو۔

جنگ بلقان و طرابلس

لیکن ۱۹۱۲ء میں جنگ طرابلس اور کارزار بلقان کے سنگین واقعات اور برطانوی پالیسی نے ان کی روح کو تڑپا دیا اور جس کی وجہ سے برٹش حکومت سے ان کا جذبۂ نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ ترکوں پر ظلم و ستم اور ان پر مصیبتوں کی خبروں نے ان کا خواب و خور حرام کر دیا اس زمانے میں ان کی بے چینیوں اور بے قراریوں کا عالم دیدنی تھا۔ ان کا نحیف و نزار جسم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ انھوں نے دارالعلوم کو بند کر دیا طلبہ کے وفود ملک میں بھیجے، خود بھی نکلے، چندہ جمع کیا اور ترکوں کی امداد کے لیے جو کچھ ہو سکتا تھا کیا۔ ترکی میڈیکل مشن بھجوانے کا انتظام کیا اور اس کے لئے مرد و سامان سفر کی جمع و فراہمی کا بندوبست کیا بقول مولانا مدنی رح "مولانا نے تھوڑی مدت

۵؎ کابل میں سات سال، ص ۵-۱۰۴

میں بہت کچھ کامیابی حاصل کرلی اور کام کرنے والوں کے لیے شاہراہ عمل قائم کردی"۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح فرماتے ہیں:

"بلقان کے خونخوار اور طرابلس کے سنگین واقعے نے مولانا کے دل و دماغ پر نہایت عجیب مگر بیچین کنندہ اثر ڈالا چنانچہ اس وقت حسب طریقہ استاذ اکبر مولانا محمد قاسم صاحب رح (در جنگ روس) مولانا نے اپنی جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی، فتوے چھپوائے، مدرسے کو بند کردیا، طلبہ کے وفود بھجوائے، خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے، چندے کیے اور ہر طرح سے مدد کی ترغیب دیکر ایک اچھی مقدار بھجوائی مگر اس پر بھی چین نہ پڑا کیونکہ جنگ بلقان کے نتیجے نے دوربینوں کو بالکل غیر مطمئن کردیا تھا اور بتلادیا تھا کہ یورپ کے سفید عفاریت اسلام کے ٹمٹماتے چراغ کو گل کرنے کی فکر میں ہیں پھر ذمہ داران برطانیہ مسٹر اسکوئیتھ وغیرہ کی روباہ بازیاں، خرس روس کی جفاکاریاں تو یقین دلاتی تھیں کہ تقسیم ٹرکی اور اجرائے وصایائے گلیڈ اسٹون کا زمانہ سر پر ہی آگیا ہے۔ جو مقاصد مسیحی دنیا کے عرصۂ دراز سے چلے آتے تھے اور جن چالوں سے اسلامی دنیا اور خلافت مقدسہ کے تکے بوٹی کیے جا رہے تھے اب ان کی انتہا کا زمانہ آگیا ہے۔ اب کوئی دن میں اسلامی وجود دنیا سے بسیط مٹا دیا جائے گا جس طرح یہودیت

تمام عالم سے اور اسلام اسپین اور پرتگال سے۔ مولانا مرحوم کو اس فکر نے سخت بے چین کر دیا، زندگی بھاری ہوگئی، نیند اچٹ گئی مگر زمانے کی تاریکیاں، موسم کی کالی کالی گھٹائیں، احوال کی نزاکتیں، مسلمانوں اور اہل ہند کی ناگفتہ بہ کمزوریاں ہر طرح اس میدان میں قدم رکھنے سے مانع ہوتی رہیں چونکہ اس مقدس ہستی کو فقط اپنے خدائے قدوس پر بھروسہ تھا اس لیے اس نے تمام خیالات اور اوہام پر لاحول پڑھا اور مردانہ وار گامزن ہوا۔ اس کو مشکلوں کا سامنا ہوا، اس کو سخت اور تند آندھیوں کا مقابلہ کرنا پڑا، اس پر باد سموم کے جھلسانے والے تھپیڑوں نے طمانچے مارے اس کے لیے احباب و اقارب مار آستین بن گئے، ہر شخص ناصح بن کر سد راہ ہوا۔ مگر اس کے پائے استقلال کے مضبوط قدموں نے ذرا بھی جنبش نہ کی۔ سب کو چھوڑ دیا مگر اپنے خدا پر بھروسہ کر کے دن رات کام میں لگا رہا۔ چونکہ کوشش کا نتیجہ کامیابی ضروری ہے۔ اس کو کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوگیا کہ ابھی تک دنیا میں کام کرنے والے لوگ بھی موجود ہیں مگر کام لینے والے بہت کم ہیں۔ مسلمانوں میں قابلیت ہے مگر ان کو جمع کرنے والا نہیں۔" [۵۱]

---

[۵۱] سفر نامہ شیخ الہند، ص د، ۶

"الحاصل مولانا نے اس تھوڑی سی مدت میں بہت کچھ کامیابی حاصل کرلی اور کام کرنے والوں کے لیے جن کو مدت سے تحیر اور مدہوشی تھی مگر طریق کار ہاتھ نہ آتا تھا۔ شاہراہ عمل قائم کردی،"[1]

حضرت شیخ الہند کا سیاسی منصوبہ

سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اوّل چھڑ گئی اور برٹش حکومت پر ضرب لگاتے اور آزادی کی منزل قریب لانے کے لیے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے مجاہدین کے مرکز یاغستان کو جہاں مولانا سیف الرحمٰن حاجی ترنگ زئی وغیرہ حضرات موجود تھے اور عرصے سے جماعت کی ضروریات پوری کر رہے تھے، پیغام بھیجا کہ اب سکون کے ساتھ کام کرنے کا وقت نہیں ہے۔ سربکف ہو کر میدان میں آجانا چاہیے۔ وہاں سے جواب آیا کہ جب تک کسی آزاد حکومت کی پشت پناہی اور امداد حاصل نہ ہوگی ہماری شجاعت اور جان بازی بے کار ہے۔ اس لیے آپ کسی حکومت کی امداد اور پشت پناہی حاصل کرنے کا انتظام کیجیے اور آپ خود یہاں تشریف لے آیئے۔

مجاہدین میں جاں بازی اور جگر کاری کا جذبہ بے انتہا تھا، لیکن انھیں کسی حکومت کی امداد حاصل نہ تھی، کوئی ملک ان کا پشت پناہ نہ تھا ہندوستان سے حضرت شیخ الہند ان کی مالی امداد کے فرائض بھی انجام دیتے تھے یا ملک کے دوسرے حصّوں سے علماء اور اہل دل انفرادی اور خفیہ طور پر مدد

[1] سفرنامہ شیخ الہند؛ ص ۷

پہنچاتے تھے۔ لیکن یہ سب امداد اور چندے بھی ضرورت کو پورا نہ کر سکتے تھے مجاہدجان توڑ کر لڑتے تھے لیکن کھانے کا سامان ختم ہو جاتا تو انھیں مورچہ چھوڑنا کر رسد کے لیے دور دراز گاؤں میں جانا پڑتا کارتوس ختم ہو جاتے تو ان کے حصول کے لیے انھیں مورچہ چھوڑنا پڑتا ان حالات میں برطانوی حکومت پر کوئی کاری ضرب نہ لگائی جاسکتی تھی^۱^ حضرت شیخ الہندؒ نے ان تمام باتوں کا اندازہ کر کے مولانا عبیداللہ سندھی کو افغانستان بھیجا تاکہ وہ افغانستان کی طرف سے حملہ کرانے کی سعی کریں اور خود حجاز جانے، ترکی زعماء سے ملاقات کرنے اور مجاہدین کے مرکز کا کوئی مستقل بندوبست کر کے مجاہدین کے مرکز یا یاغستان پہنچ جانے کا منصوبہ تیار کیا۔ اسی زمانے میں برٹش حکومت نے ایسے تمام افراد کو گرفتار کر لینے کا فیصلہ کیا جن سے انھیں غیر مشروط تعاون و امداد اور ان کی پالیسی کی مکمل حمایت کے بجائے مخالفت اور برٹش حکومت کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے، کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے اور ملک میں انتشار پھیلانے کا خطرہ تھا۔ یہ صورت حال حضرت شیخ الہندؒ کے لیے بڑی تشویشناک تھی اور اگر وہ گرفتار ہو جاتے تو سارے منصوبے پر پانی پھر جاتا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی حجاز روانگی

مولانا غلام رسول مہر صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے انھیں ایک مرتبہ بتایا کہ

"ہندوستان میں گرفتاریاں شروع ہو گئیں، تو مولانا محمود حسن کو تشویش پیدا ہوئی کہ کہیں بیٹھے بٹھائے گرفتار نہ ہو جائیں۔

---

۱ نقش حیات جلد دوم، مولانا حسین احمد مدنی، ص ۱۴۵

ان کے نزدیک کام کا سازگار زمانہ آگیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ہر اقدام کے لیے آزاد رہیں۔ چنانچہ انھوں نے مجھے ابوالکلام آزاد کو بلا بھیجا۔ دھلی میں ملاقات ہوئی، دیر تک معاملے کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی رہی میری (مولانا آزاد کی) قطعی رائے یہ تھی کہ باہر نہ جانا چاہیئے۔ اور یہیں رہ کر اپنا کام جاری رکھنا چاہیئے۔ اگر اس اثنا میں گرفتاری کی منزل آجائے تو اسے قبول کیے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ باہر جاکر کچھ نہ ہوسکے گا اور دوسرے ملک میں معطل بیٹھا رہنا بہتر تھا لیکن مولانا محمود حسن نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے حجاز جائیں پھر ترکوں سے ربط ضبط پیدا کر کے ایران و افغانستان کے راستہ یاغستان پہنچ جائیں جسے وہ آزادی کے لیے تمام سرگرمیوں کا مرکز بنانا چاہتے تھے"[۱]

حضرت شیخ الہندؒ اپنے منصوبے کے مطابق حجاز کے لیے روانہ ہوتے ادھر ان کی گرفتاری کا وارنٹ نکلا ممبئی پولیس کو تار کے ذریعے گرفتاری کا حکم پہنچا مگر عقیدت مندوں کے ہجوم اور خلقت کے ازدحام کی وجہ سے پولیس انھیں گرفتار کرنے سے قاصر رہی پھر جہاز کے کپتان کو تار دیا گیا مگر جہاز پر یہ تار

اِس وقت موصول ہوا۔ جب حضرت شیخ الہند جزیرہ سعد میں قرنطینہ کے لیے اتر چکے تھے اور اس طرح اِس دفعہ بھی آپ گرفتاری سے بال بال بچ گئے اور بخیریت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

مکہ معظمہ کے گورنر غالب پاشا تھے جو حضرت شیخ الہند سے پہلے سے واقف تھے۔ آپ نے ان سے ملاقات کی اور اپنے منصوبے سے انھیں آگاہ کیا۔ غالب پاشا نے ہر طرح آپ کی امداد اور آپ سے تعاون کا یقین دلایا اور اس سلسلے میں آپ کو کئی تحریریں دیں۔ ایک تحریر مسلمانانِ ہند کے نام تھی جس میں کہا گیا تھا کہ تمام ہندوستانیوں کو آزادی کامل پر آمادہ ہوجانا چاہیے۔ اور اپنی جد وجہد کو تیز کردینا چاہیے صلح کے لیے کانفرنس منعقد ہوگی تو اس میں آزادئ ہند کی حمایت کریں گے یہی وہ مشہور تحریر ہے جو تاریخ میں "غالب نامہ" کے نام سے مشہور ہے ایک دوسری تاریخ گورنر مدینہ بصری پاشا کے نام تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ مولانا محمود حسن کو استنبول تک بحفاظت پہنچانے اور انور پاشا اور جمال پاشا سے ان کی ملاقات کا بندوبست کرادیا جائے۔ تیسری تحریر غازی انور پاشا وزیر حربیہ ترکیہ کے نام تھی۔ اِس میں حضرت شیخ الہند کے نام کے بعد اِن کے منصوبے میں امداد دینے کی سفارش کی گئی تھی۔

غازی انور پاشا سے ملاقات

حضرت شیخ الہند یہ تحریریں لے کر مدینہ منورہ تشریف لائے حسن اتفاق سے غازی انور پاشا بھی وہاں پہنچ گئے اور اس طرح ان دونوں ترکی زعما سے آپ کی

ملاقات مدینہ منورہ ہی میں ہو گئی۔ انور پاشا بھی آپ کی شہرت سن چکے تھے جب آپ نے انھیں اپنا منصوبہ بتایا تو وہ نہایت درجہ خوش ہوئے امداد کا وعدہ فرمایا اور چند تحریریں لکھ کر دیں جن میں آزاد قبائل کو مجاہدین کا ساتھ دینے اور انگریزوں کے خلاف اپنی کارروائیوں کو تیز تر کر دینے کی ہدایت تھی نیز آزاد قبائل کو امداد کا اطمینان دلایا گیا تھا۔

یاغستان پہنچنے کا مسئلہ

اب سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند یاغستان کس طرح پہنچیں۔ ایران کا راستہ وہاں انگریز فوجوں کے پہنچ جانے کی وجہ سے بالکل بند ہو گیا تھا۔ بحری راستے سے ہندوستان ہو کر آزاد قبائل جانا آپ مناسب خیال نہ فرماتے تھے۔ آخر انور پاشا اور جمال پاشا کے مشورے سے یہ طے پایا کہ [illegible] ہوتے ہوئے آزاد قبائل تک پہنچا جائے لیکن ترکی زعماء اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد کرنے سے معذور تھے۔

شریف حسین کی بغاوت

ان امور خاصہ کی انجام دہی کے بعد آپ دوبارہ مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے خیال تھا کہ غالب پاشا سے ملاقات کے بعد منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوں گے۔ غالب پاشا اس وقت طائف میں تھے۔ آپ طائف تشریف لے گئے لیکن قدرت کو منظور نہ تھا کہ سفر جہاد شروع ہو وہ آپ کے سامنے ایک اور میدان سعادت کھولنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اسی کے اسباب بھی پیدا ہوتے چلے گئے۔ آپ کا شتربان ایک ہفتے کی چھٹی لے کر چلا گیا اور دوسری کسی سواری کا انتظام نہ ہو سکا

ابھی چند دن ہی گذرے تھے کہ شریف حسین نے انگریزوں کی مدد سے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور حالات کا نقشہ یکسر پلٹ گیا۔ اس طرح ۲۰ رجب ۱۳۳۴ھ سے لے کر ۶ شوال ۱۳۳۴ھ تک طائف سے نکلنا ناممکن ہو گیا۔ ۱۰ شوال کو حضرت شیخ الہند مکہ معظمہ تشریف لائے یہاں سے جدہ تشریف لے گئے وہاں سے پھر مکہ معظمہ تشریف لائے۔

ترکوں کی تکفیر کا فتویٰ

یہاں خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی نے انگریزوں کے ایما پر ترکوں کی تکفیر اور شریف حسین کی بغاوت کے جواز میں ایک فتویٰ تیار کر رکھا تھا جس پر علمائے وقت نے دستخط بھی ثبت فرما دیئے تھے۔ حضرت شیخ الہند کے سامنے یہ فتویٰ پیش ہوا تو آپ نے اس کی تصویب و تصدیق سے انکار کر دیا۔ اس چیز نے شریف اور اس کے حمایتیوں کو سخت مشتعل کر دیا۔

ریشمی رومال

مولانا عبید اللہ سندھی افغانستان پہنچنے کے بعد اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہو گئے تھے۔ انھوں نے وہاں ہندوستان کی آزاد عارضی حکومت قائم کی جسے افغانستان کی حکومت نے تسلیم کر کے اس سے معاہدہ کر لیا، دوسرے ملکوں میں بھی اس کی سفارتیں بھیجنے کا انتظام کیا گیا تاکہ وہ بھی اسے تسلیم کر کے اس کی اخلاقی و مادی مدد کریں۔ مولانا سندھی نے ان تمام حالات کو ایک رومال پر ریشم سے کاڑھ کر ایک معتمد شخص مسمی عبد الحق کے ہاتھ حضرت شیخ الہند کی تحریک کے ایک خاص رکن شیخ عبد الرحیم کو سندھ بھجوایا تاکہ وہ اسے خود یا کسی قابل اعتماد شخص کے ذریعے آپ کو حجاز

میں پہنچا دیں لیکن وہ خط (رومال) شیخ عبدالرحیم تک پہنچنے کے بجائے عبدالحق کے مربی خان بہادر رب نواز خاں (ملتان) کے ہاتھ میں پہنچ گیا جس نے اسے انگریز گورنر کی خدمت میں پیش کردیا اور اس نے وطن و ملت کی آزادی اور بہی خواہی پر انگریز کی خوشنودی کو ترجیح دی[1]۔

شیخ الہند کی گرفتاری

اس رومال کا حکومت کے ہاتھ لگنا تھا کہ ہندوستان بھر میں گرفتاریوں اور قید و بند اور تحقیق و تفتیش کا ایک اور لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ تاریخ میں یہ کوشش ریشمی خطوط یا ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے موسوم ہے۔ اب حکومت کو اپنی اس کوتاہی کا احساس ہوا کہ اس نے مولانا محمود حسن کو گرفتار نہ کرکے کتنی بڑی غلطی کی ہے لیکن حجاز میں شریف مکہ کی بغاوت کی کامیابی کے بعد انگریزوں کو بجا طور پر توقع تھی کہ آپ اب بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ غالب نامہ کی اشاعت سے برٹش حکومت بوکھلائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد انور پاشا کی تحریر برٹش حکومت کے علم میں آئی اور اسے پکڑ لینے کی انتہائی کوشش کے باوجود اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو حکومت حواس باختہ ہوگئی اور اس نے طے کرلیا کہ حضرت شیخ الہند کو بہر صورت گرفتار کرلینا چاہیے اس کے بغیر حالات پر قابو نہیں پایا جاسکتا چنانچہ شریف حسین کو حکم بھیجا کہ وہ آپ کو گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کردے۔ شریف نے نہایت فرمانبرداری کے ساتھ اس حکم کی تعمیل کی۔ آپ کو اور آپ کے رفقاء مولانا

---

[1] آپ بیتی (حصہ اول) ظفر حسن ایبک، ص ۱۱۳

حسین احمد مدنی ؒ، مولانا عزیز گل، مولانا حکیم نصرت حسین اور مولانا وحید احمد کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

اسارت مالٹا

فروری ۱۹۱۷ء میں آپ کو جزیرہ مالٹا پہنچا دیا گیا۔ اس زمانے آپ نے بڑے مصائب برداشت کیے۔ تکلیفیں اٹھائیں۔ مستقل عوارض میں مبتلا رہے جو بالآخر مرض الموت کا سبب بنے لیکن آپ کے پائے استقامت میں لغزش نہ پیدا ہوئی۔ مالٹا میں آپ تین سال تک اسیر رہے۔ مارچ ۱۹۲۰ء میں آپ کی رہائی کا حکم ہوا۔

ہندوستان واپسی اور مرض الموت

جون ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند ؒ ہندوستان تشریف لائے۔ اگرچہ آپ کی صحت گر چکی تھی لیکن مشاغل ملی کا انہماک آپ کو چین نہ لینے دیتا تھا مولانا سید محمد میاں نے آپ کے دور آخری کا نقشہ نہایت مؤثر الفاظ میں کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ الہند ہندوستان تشریف لائے تو مرض الموت کا آغاز تھا آپ کو وجع المفاصل کا قدیم سے عارضہ تھا۔ کثرت بول کی شکایت بھی پرانی تھی۔ اس پر مالٹا کا سرد موسم اور مزید برآں حضرت والا کی شب بیداری اور ریاضت اور قلت غذا بایں ہمہ پیرانہ سالی اور پھر ترکوں کی شکست اور اپنی جد و جہد کی ناکامی کا صدمہ۔ ان تمام اسباب کی بنا پر گویا مرض الموت کا سلسلہ مالٹا ہی میں شروع ہو گیا تھا پھر تقریباً تین ماہ تک

راستے کی مشقت اور ہندوستان پہنچنے کے بعد خلقت کا ہجوم تحریک کی ترقی، مشاغل کی کثرت وغیرہ یہ سب چیزیں اضافہ مرض کا سبب بنتی رہیں انتہا یہ کہ آپ کو دق ہو گئی مگر درحقیقت اس شیخ طریقت اور شیخ سیاست کی ہمت و استقلال ہر ایک مسلمان بلکہ ہر ایک انسان کے لیے سبق آموز ہے کہ تپ دق آخری اسٹیج ہے چلنا پھرنا تو درکنار بیٹھنا بھی ممکن نہیں مگر اس حالت میں تحریک کی قیادت جاری ہے اجلاسوں

کی شرکت کے لیے سفر ہو رہا ہے، صدارت فرمائی جا رہی ہے۔ العظمۃ للہ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ بستر مرگ پر ایک شیخ فانی کا یہ بے پناہ جذبۂ عمل"۔ [۵۱]

جامع ملیہ کا افتتاح

اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامع ملیہ اسلامیہ کے لیے علی گڑھ اس حالت میں تشریف لے گئے کہ ڈولی میں پڑ کر جلسہ گاہ تک پہنچے تھے چند منٹ بیٹھ کر بھی خطاب کرنا مشکل تھا، مختصر سا خطبۂ صدارت تھا، لیکن علامہ شبیر احمد عثمانی رح نے پڑھ کر سنایا تھا۔

ایک تاریخی خطاب

اس خطبے کا ایک ایک لفظ آپ کی سیاسی بصیرت، ژرف نگاہی اور ملی بہی خواہی پر دال اور سوز دلی اور عزیمت دعوت کا آئینہ دار ہے۔ آپ کے یہ تاریخی الفاظ اسی خطبے کے ہیں۔

"میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت

---

[۵۱] علمائے حق (حصہ اوّل) مولانا سید محمد میاں کتب خانہ فخریہ، مراد آباد ۱۹۱۳ء ص ۱۳۰ - ۲۱۳

میں آپ کی اس دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں، بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف وہراس طاری ہو جاتا ہے خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب وضرب کا۔" [۵۱]

دل سوزئ ملت

ملت اسلامیہ ہندیہ کی تاریخ میں حضرت شیخ کے یہ الفاظ سونے کے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں گھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں، تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔" [۵۲]

---

[۵۱] علمائے حق (حصہ اوّل)، مولانا سید محمد میاں کتب خانہ فخریہ مراد آباد، ص

[۵۲] " " " " " ص ۲۱۴

حضرت شیخ الہندؒ کی فراست

وفات سے صرف ایک ہفتہ قبل دہلی میں جمعیت علمائے ہند کا دوسرا سالانہ اجتماع[۵۰] حضرت شیخ الہند کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس اجتماع کا سب اہم مسئلہ انتخاب امیر الہند کا تھا۔ آپ اس کے لیے حد درجہ بے چین تھے کہ یہ انتخاب اسی موقع پر کر لیا جائے۔ مولانا عبد الصمد رحمانی صاحب لکھتے ہیں:۔

> وہ لوگ جو اس میں شریک تھے، جانتے ہیں کہ اس وقت حضرت شیخ الہند ایسے ناساز تھے کہ حیات کے بالکل آخری دور سے گذر رہے تھے، نقل و حرکت کی بالکل طاقت نہ تھی لیکن باوجود اس کے ان کو اصرار تھا کہ اس نمائندہ اجتماع میں جب کہ تمام اسلامی ہند کے ذمہ دار اور ارباب حل و عقد جمع ہیں، امیر الہند کا انتخاب کر لیا جائے اور میری چارپائی کو اٹھا کر جلسہ گاہ میں لے جایا جائے۔ پہلا شخص میں ہوں گا جو اس امیر کے ہاتھ پر بیعت کرے گا مگر نزاکت حال کو دیکھ کر طبیب و ڈاکٹر اور خدام مخلصین کی اس وقت رائے ہوئی کہ حضرت شیخ الہند کو اس وقت تکلیف نہ دی جائے اور اس مسئلہ کو حضرت شیخ الہند کی صحت پر اٹھا کر رکھا جائے تاکہ پورے اطمینان اور انشراح صدر کے ساتھ اس کو عمل میں لایا جائے۔“ [۵۱]

---

۵۰ جمعیت کا اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر کو ہوا تھا۔ ۵۱ تاریخ امارت ص ۵۲

اس وقت حضرت شیخ الہند کو اضطراب کے حقیقی سبب کو کوئی شخص نہیں سمجھ سکا۔ لیکن اس وقت انتخاب امیر کے التواء و تعویق سے جو الجھنیں اور رکاوٹیں اس مسئلہ میں پیدا ہوئیں، اس سے حضرت شیخ الہند کے اضطراب و بےچینی کے حقیقی سبب کو سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ کی فراست اور بصیرت ایمانی اس حقیقت کو دیکھ رہی تھی کہ جس آسانی کے ساتھ اس وقت یہ مسئلہ بلا کسی اختلاف کے طے پا سکتا تھا، بعد میں ممکن نہ ہوگا، آپ جانتے تھے کہ یہ مسئلہ قواعد و ضوابط کا پابند نہیں کیا جا سکتا بلکہ عمل و اقدام کا متقاضی ہے بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ حضرت شیخ الہند کی بےچینی درست تھی۔ آپ کے انتقال کے بعد خود ارباب دیوبند دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک مخصوص طبقہ مصالح وقت اور اپنی ذات کو ملی مفادات میں نظر انداز نہ کر سکا علمائے فرنگی محل جو ملی معاملات میں دیوبند اور جمعیت علمائے ہند سے نہ صرف قریب بلکہ ان کے شریک رہے تھے وہ اپنی مخصوص جماعت کے نقطۂ نظر سے سوچنے لگے اور علمائے بدایون جو دیوبند کے مقابلے میں فرنگی محل سے ذہنی قرب رکھتے تھے وہ نظم جماعت اور امارت شرعیہ کے ایک ایسے نظام کے بارے میں سوچنے لگے جس میں مرکزیت اور مرجعیت انھیں حاصل ہو۔ غرضیکہ حضرت شیخ الہند کے انتقال سے ہندوستان کی اسلامی قوتیں فرادیٰ فرادیٰ منتشر ہوگئیں اور نظم جماعت کے اسلامی تصور کی حقیقت افتراق و اختلاف میں گم ہوگئی۔

وفات حسرت آیات

دہلی میں جمعیت علمائے ہند کا مذکورہ سالانہ جلسہ جو آپ کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس میں بقول

مولانا سید محمد میاں صاحب اس حالت میں شرکت فرمائی تھی

"بیماری اور نقاہت کی وجہ سے اسٹیج پر تھوڑی دیر بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ خطبہ صدارت لکھا ہوا تھا اور کسی اور نے پڑھ کر سنایا تھا اسی زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا سنگ بنیاد آپ کے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا۔"

ابھی دہلی ہی میں اپنے مرید باصفا ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مکان پر مقیم اور انھیں کے زیر علاج تھے کہ پیام اجل آ پہنچا۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء کو آپ اس جہانی فانی سے رحیل عالم جاودانی ہوئے اور مسلمان اس روح عظیم مقدس کے وجود گرامی اور اس کی رہنمائی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔

اعتراف عظمت

حضرت شیخ الہند کے سیاسی مرتبے اور آپ کی سیاسی بصیرت اور خدمت کا اعتراف ملک اور بیرون ملک کے اکابر نے کیا ہے۔ ان تمام اعترافات کا احاطہ تو ممکن نہیں صرف چند پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

امیر امان اللہ خاں نے افغانستان کی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"محمود حسن ایک نور ہے جس کی روشنی میں ہم بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں۔"

جمال پاشا نے حجاز میں آپ سے ملاقات اور گفتگو کے بعد کہا تھا:

"ان مختصر سی ہڈیوں میں کس قدر دین اور سیاست بھری ہوئی ہے اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔"

برطانوی حکومت کے ایک نہایت ذمہ دار رکن مسٹر سر جیمس مسٹن گورنر

یوپی نے کہا تھا۔

"اگر محمود حسن کو جلا کر راکھ بھی کر دیا جائے تو اس کی راکھ بھی انگریزوں سے کترا کر گذرے گی"

اس تمام سیاسی بصیرت اور ملی خدمات کیساتھ دینی حیثیت سے آپ کا وجود گرامی علم و فضل، تقویٰ و خشیت الٰہی، اخلاص و للہیت، قرآن و حدیث میں درک و بصیرت، مجتہدانہ شان میں صحابہ و تابعین کرام اور علمائے سلف کی یاد دلاتا تھا۔

عازم وقت

۱۹۱۴ء میں جب مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کی تحریک شروع کی اور منصب ریاست کے لیے انھیں ایک ایسے عازم وقت کی تلاش ہوئی جس کا علم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو، جس کا قدم منہاج نبوت پر استوار ہو جس کے قلب پر اللہ تعالیٰ حکمت و رسالت کے تمام اسرار غوامض اور معالجہ اقوام اور طبابت عہد و ایام کے تمام سرائر و خفایا اس طرح کھول دے کہ وہ صرف ایک صحیفۂ کتاب و سنت اپنے ہاتھ میں لے کر دنیا کی ساری مشکلوں کا حل اور ارواح و قلوب کی ساری بیماریوں کی شفا کا اعلان کر دے تو دورۂ آخر کے افاضل واکابر علماء میں حضرت حضرت شیخ الہندؒ کی عظیم و مقدس روح تھی جو مولانا آزاد کے نزدیک اس منصب کی اہل اور اس معیار پر پوری اترتی تھی۔ مولانا آزاد نے آپ کی اسلامی غیرت، ملی حمیت، حق پرستی اور عزیمت دعوت کا نہایت شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ جمعیت علمائے ہند کے اجلاس لاہور ۱۹۲۱ء کے خطبۂ صدارت

تحریری میں تمہیدی مباحث کے بعد فرماتے ہیں :۔

"اس تمہید بیان کے بعد میں بالکل

عظمت اسلاف کی آخری یادگار

آمادہ تھا کہ مقاصد و مطالب کا سفر شروع کر دوں لیکن اچانک ایک غمگین حادثے کی یاد نے میرے قدم روک دیے آپ کی اس جمعیت کا گزشتہ اجلاس مجمع علمائے ہند کے جس بزرگ و محترم وجود کی رہنمائی و صدارت میں منعقد ہوا تھا آج وہ ہم میں نظر نہیں آتا اور اس کی موجودگی کی برکتوں سے محروم ہو گئے ہیں میرا اشارہ حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی کی جانب ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ آج آپ میں سے ہر فرد کو ان کی یاد دعوت غم دے رہی ہوگی۔ ان کی وفات بلاشک ایک قومی ماتم ہے اور ہم سب کو ان کی یاد کی عزت میں چند لمحوں کے لیے رک جانا چاہیے۔"

"مولانا مرحوم ہندوستان کے گزشتہ دور کے علمار کی آخری یادگار تھے ان کی زندگی اس دور حرماں و فقدان میں علمائے حق کے اوصاف و خصائل کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمال حقہ میں بسر ہوا وہ علمائے ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ستر برس کی عمر میں جب ان کا قدان کے دل کی طرح

اللہ کے آگے جھک چکا تھا عین جوارِ حرم میں گرفتار کیے گئے اور کامل تین سال تک جزیرۂ مالٹا میں نظر بند رہے یہ مصیبت انھیں صرف اس لیے برداشت کرنی پڑی کہ اسلام اور ملت اسلام کی تباہی و بربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کرسکا اور انھوں نے اعدائے حق کی مرضات وہوا کی تسلیم و اطاعت سے مردانہ وار انکار کردیا۔"

فی الحقیقت انھوں نے علمائے حق و سلف کی سنّت زندہ کردی اور علمائے ہند کے لیے اپنی سنّت حسنہ یادگار چھوڑ گئے۔ وہ اگرچہ اب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی روحِ عمل موجود ہے اور اس کے لیے جسم کی طرح موت نہیں۔[1]

---

[1] خطبہ صدارت تحریری، صفحہ ۱۰

باب ششم

خلفائے مجاز

مولانا عبدالقادر قصوریؒ

اس جماعت کے بزرگوں میں کچھ پہلے آئے۔ انھوں نے زمین ہموار کی۔ کچھ اُن کے بعد آئے انھوں نے اس میں علم وعرفان کی تخم ریزی کی اور کچھ آخر میں آئے۔ انھوں نے اس مزرعہ دین کی آبیاری اور اس کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔ لیکن تقدم و تاخر کے باوجود اخلاف اپنے اسلاف کرام سے علم و تقویٰ، اخلاص عمل اور ایثار جان و مال میں کم تر نہ تھے۔ ان کے اخلاص و عمل اور علم و عرفان کا پیمانہ بھی اتنا ہی بلند و ارجمند تھا جتنا کہ اسلاف کے حصے میں آیا تھا۔ وہ تمام اسلاف سے اخلاف تک۔ درحقیقت ایک ہی سلسلۃ الذہب کی مختلف کڑیاں اور ابر نیساں کے قطرے تھے جو اسلام کے صدفِ تعلیم و تربیت میں جگہ پاکر موتی بن گئے تھے۔ ان کے لیے اول و آخر اور تقدم و تاخر کی بحث لاحاصل ہے۔

مولانا عبدالقادر علمائے حق کے اسی مقدس گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے جس نے دوسرے سرے پر جگہ پائی تھی۔ وہ ابر نیساں کا ایک قطرہ تھے، جس کی قسمت میں موتی بننا تھا۔ آپ انھیں آخرالسلف کہیے کہ ان کا تعلق دورِ آخر سے تھا لیکن وہ ایسے آخرالسلف تھے جو

اسلاف کے لیے باعثِ افتخار ہوتے ہیں۔ وہ سلسلے کی آخری کڑی تھے لیکن ان کی تعلیم و تربیت دینی اور اصلاح و تبلیغ اسلامی سے سلسلے کی جو دوسری کڑیاں ڈھلی ہیں۔ ان کے لیے ان کا وجود ربط و تسلسل کا باعث ہے۔ اگر یہ کڑیاں نہ ہوتیں تو زنجیر مکمل نہ ہوتی۔ وہ بارش کا آخری قطرہ تھے لیکن مسلمانوں کے نخلِ تعلیم و تربیت کی شادابی اور بالیدگی کا انحصار اسی پر تھا۔

ان کے خاندان کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں۔ یہ خاندان کون سا تھا، کہاں سے آیا، کب آیا؟ لیکن خاندان کے افراد کی شکل و شمائل سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندی النسل ہرگز نہ تھا کہیں باہر ہی سے کسی زمانے میں آیا تھا۔ لاہور کی تحصیل قصور نے اس خاندان کے قیام و سکونت سے شرف پایا۔ قصور میں یہ خاندان اپنی عزت و وجاہت کے لیے مشہور تھا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مولانا عبدالقادر صاحب مطلعِ سیاست پر نمودار ہوئے اور اس شان کے ساتھ کہ دنیا ان کی فراست و تدبر اور شخصیت کی رنگینیوں اور سیرت کی دلربائیوں کے نظارے میں محو ہوگئی۔ ان کی ذات نہ صرف لوگوں کی نظر و توجہ کا مرکز تھی بلکہ عقیدت و ارادت کا مرجع بھی تھی۔ وہ تقریباً ربع صدی تک اسلامی ہند کی سیاسی و دینی رہنمائی کے منصب پر فائز رہے۔ تحریک جہاد کے سلسلے کی وہ نہایت اہم شخصیت تھے۔ مجاہدین چمرقند کی امداد کے نظام میں وہ پنجاب میں مرکزیت کے حامل تھے۔ ۱۹۲۰ء میں تحریکِ ہجرت کے نظم و بیعت کے لیے وہ مولانا آزادؒ کی جانب سے ماذون و مامور تھے۔ وہ بلاتفریق مذہب و ملت پنجاب کے ہر طبقۂ خیال میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے

جاتے تھے۔ پنجاب خلافت کمیٹی کے وہ صدر تھے۔ پنجاب جمیعت نیشنل کانگریس
کمیٹی کے بھی وہ مدت تک صدر رہے تھے اور جب تک وہ اپنی صحت کی
بنا پر کنارہ کش نہیں ہوئے، آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔
۱۹۳۱ء میں کراچی کانگریس کے موقع پر وہ اس ذمہ داری سے سبک دوش
ہو گئے اور اپنی جگہ ڈاکٹر محمد عالم کو ممبر بنوا دیا تھا۔ پھر جب صحت زیادہ خراب
ہونے لگی تو سیاست سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ مرکزی خلافت کمیٹی
کی مجلس عاملہ کے بھی وہ ممبر تھے۔ ہر مکتبۂ فکر اور ہر طبقۂ خیال کے لوگوں کو
ان پر اعتماد تھا اور یقین رکھتے تھے کہ ان کی شخصیت ذاتی اغراض سے بلند ہے
اور وہ کوئی قدم ملک اور قوم کے مفاد کے خلاف نہیں اٹھا سکتے۔ بقول
شورش کاشمیری؛

"وہ ایثار نفس اور ایثار ذات کا ایک قابلِ عزت نمونہ تھے۔"[1]

ان کی فراست معروف اور دیانت ہر کرومہ میں شک و شبہ سے بلند
رہی۔ مولانا نصر اللہ خاں عزیز نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا گھرانہ
اس سلسلۂ جہاد کی ایک کڑی تھا جس کا تعلق چمرقند کے مجاہدین سے تھا۔
مجاہدین ہندوستان آتے جاتے ان کے یہاں قیام کرتے تھے اور ان کی
مالی اعانت مولانا ہی کے توسط سے مرکزی مجاہدین میں پہنچتی تھی۔ مولانا
نصر اللہ خاں عزیز ان کے فہم و تدبر، ان کے اخلاص اور دیانت، ان کے سیاسی مقام

---

[1] ہفت روزہ چٹان لاہور ۱۹۵۳ء کا یہ ایک تراشہ ہے جس کی تاریخ جلد بندی میں کٹ گئی ہے۔

اور مولانا آزاد سے اِن کے تعلق اور مولانا کے ان پر اعتماد کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"پنجاب خلافت کمیٹی کے وہ صدر تھے اور مرکزی مجلس خلافت میں ان کو بلند مقام حاصل تھا۔ ان کی معاملہ فہمی، تدبر اور علم و دانش ہر طبقے میں مسلم تھی۔ خود مولانا ابوالکلام آزادؒ جو اپنے وقت کے عبقری سیاست دان تھے، ان سے بے حد متاثر تھے اور ہر معاملے میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ تحریکِ خلافت کے زمانے میں بھی ان کا تعلق تحریک مجاہدین سے تھا۔ اس کا علم مجھے ایک روز پنجاب خلافت کمیٹی کے اجلاس میں ہوا۔ خلافت کمیٹی کے حسابات پیش ہو رہے تھے ان میں کئی ہزار کی ایک رقم رجسٹر میں درج تھی مگر اس کی رسید موجود نہیں تھی۔ بعض ارکان نے اس پر اعتراض کیا اور اس کا مصرف معلوم کرنے پر اصرار کیا اس پر سکرٹری نے مولانا کی طرف رجوع کیا اور انھوں نے بتایا کہ یہ رقم مجاہدین کو دی گئی ہے اور سب لوگ مطمئن ہو گئے"[1]

مولانا غلام رسول مہر نے ان کے انتقال پر ایک نہایت شاندار مقالہ لکھا اور اس زمانے میں ان سے سیاسی اختلافات کے باوجود ان کے ایثار اور ان کی دیانت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

[1] ہفت روزہ چٹان لاہور، ۱۷ر نومبر ۱۹۶۹ء ص ۱۰

وہ قومی خدمت کے میدان میں آتے تھے تو اللہ کے فضل سے مادی وسائل کے نقطہ نگاہ سے یہ ہر طرح فارغ البال تھے۔ جب تک ان کی صحت لوگوں کے لیے مساعد رہی وہ اپنے وسیع وسائل کو بے توقف قوم وملت کی خدمت میں اٹھاتے رہے۔ انھوں نے قومی کاموں کے سلسلے میں ہزاروں میل کے سفر کیے لیکن جس حد تک ہمیں معلوم ہے کبھی کسی قومی سرمائے پر ایک حبہ کا بوجھ بھی نہ ڈالا۔ بلکہ وہ جب خلافت کے دفتر میں بیٹھ کر کوئی ذاتی خط لکھتے تھے تو اس کے لیے کاغذ ٹکٹ اور لفافے تک اپنی جیب سے منگاتے تھے [1]

اسی موقع پر ایک اور شذرے میں ان کے اخلاص، ایثار، تدبر اور مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لیے ان کی بے چینیوں کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:

"مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم نے سالہا سال تک کانگریس کی خدمت کی اور پنجاب پراونشل کانگریس کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب میں کانگریس کو ان سے زیادہ مخلص، صاحب ایثار اور بے غرض رہنما آج تک نہیں ملا..... مرحوم ومغفور کی عظمت اخباروں کے شذروں یا

افتنا جیوں کی محتاج نہ تھی۔ وہ جس مسلک کو اچھا سمجھتے تھے بے باکانہ اِس پر کار بند رہے۔

اِن کے محاسن کا کوئی حق شناس انکار نہیں کرسکتا وہ حد درجہ ایثار پیشہ، غیور، بہادر اور مدبر تھے۔ سینکڑوں ہزاروں کارکن قومی سرمایوں سے اپنے مصارف وصول کرتے رہے اور یہ کوئی گناہ نہیں تھا۔ لیکن مولانا مرحوم نے اپنی ساری زندگی میں ایک حبہ بھی نہ لیا۔ قومی کاموں کے سلسلے میں سارے مصارف خود برداشت کرتے رہے۔ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی بہت سی خدمات انجام دیں۔ اگرچہ نہرو رپورٹ کے وقت ان کا مسلک ہمارے نزدیک صحیح نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ انھیں کوئی ذاتی آرزو ادھر لے گئی۔ یہ محض اختلاف رائے تھا جو نیک نیتی پر مبنی تھا۔ اس کے باوجود کوئی حق شناس آدمی اِس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ مولانا ئے مرحوم موجودہ دور میں بے لاگ اور بے لوث رہنمائی کا ایک نادر نمونہ تھے اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی تڑپ ہمارے علم کے مطابق ہر دور اور ہر عہد میں ان کی سرگرمیِ عمل کا مورد و محور رہی حالانکہ بعض حالتوں میں ہمیں بھی ان سے اختلاف رائے کی ضرورت پیش آئی۔[1]

زندگی کے آخری آٹھ دس برس انھوں نے ذکر و عبادت اور کتابوں

ا۔ [illegible] انقلاب لاہور ۲ نومبر ۱۹۴۹ء صہ ۳

کی صحبت میں بسر کیے۔ ملک کے سیاسی معاملات میں ان کا اندازِ فکر وہی تھا جو جماعت اہلِ حدیث کے دوسرے اکابر کا تھا۔ ان کے تمام تذکرہ نگاروں نے ان کی دین داری، تقویٰ، ایثار، خدمتِ ملت اور سیاسی و دینی رہنمائی میں ان کے اخلاص اور ان کی بصیرت و فراست کا اعتراف کیا ہے

مولانا مہر صاحب مرحوم نے اپنے مقالے میں جس کا تذکرہ پچھلی سطروں میں آچکا ہے۔ ان کے علم و فضل، اوصاف و کمالاتِ سیرت، خدماتِ دینی و ملی کا نہایت کھلے دل سے اعتراف، و دینی و ملی خدمت کے میدان میں ان کے انتقال سے پیدا ہونے والے خلا کا تذکرہ اور ان کی وفات پر نہایت پرسوز الفاظ میں ماتم کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"ہر انسان کی موت پر اس کے عزیز اور رفیق طبعاً علی قدر العلائق گریہ و ماتم کرتے ہیں لیکن ایسے انسان روزانہ پیدا نہیں ہوتے جن کا ماتم دنیا کے عام روابط عزیز داری سے بدرجہا زیادہ وسیع ہو یا جن کی خالی کردہ جگہ کے پُر ہونے کی امید قرنوں تک پوری ہوتی نظر نہ آئے۔ حضرت عبدالقادر ایسے ہی نادر الوجود انسان تھے وہ اپنے علم و فضل، اخلاق و طبیعت

لہ تذکرہ نگاروں سے میری مراد مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا غلام رسول مہر مولانا عبدالمجید سالک، مولانا نصر اللہ خان عزیز، پروفیسر محمد سرور اور شورش کاشمیری ہیں

اور روش و عمل کے اعتبار سے سلفیت کا ایک بدیع مرقع تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دورِ حاضر کا کوئی ضروری اور مفید وصف ایسا نہ تھا جس سے وہ بوجہ احسن متصف نہ ہوں۔ پھر ان کی ساری زندگی بہترین قومی، ملّی اور دینی خدمات میں گزری تقویٰ، ایثار اور جہاد فی سبیل اللہ میں انھیں رفیع مرتبہ حاصل تھا۔ وہ ایک قرن تک ہندوستان کی سیاسی، وطنی، ملّی تحریکات میں ایک عالی مرتبت اور باثر رکن کی حیثیت میں کارفرما رہے اور اس صوبے میں تو برسوں عملی قومی زندگی کا سب سے بڑا مرکز وہی تھے۔ انھوں نے شہرت کی کبھی آرزو نہ کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں ہندوستان گیر شہرت عطا کی۔ وہ دولت کے کبھی خواہاں نہ ہوئے لیکن دولت بھی انہیں بقدر افراط میسر رہی.... ان کی موت ایک ایسے فرد کی موت ہے جو علم و فضل کے گوناگوں محاسن کی وجہ سے ایک جماعت کے برابر تھا۔ ان کی زندگی کے بہترین لمحات خدمتِ خلق، خدمتِ دین اور خدمتِ وطن میں گزرے اور کیسی خدمت؟ وہ خدمت نہیں جس کا طول و عرض ہمارے عہد میں بالعموم چند نعروں یا جلوس یا پھولوں کے ہاروں یا چند لغو تقریر وں تک محدود ہوتا ہے بلکہ حقیقی، محسوس، پائیدار اور مستقل اور نتیجہ خیز خدمت۔ وہ خدمت جسے ایک عمل پرور اور عمل کوش دل خدمت

قرار دے لے؛

اس مقالے میں ان کے ایثار للہ و فی اللہ اور دینی و ملی کارکنوں کی خدمت گزاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بیسیوں کارکنوں کے مختلف مصارف برسوں اپنی جیب سے ادا کرتے رہے اور انداز ایسا تھا کہ ان کارکنوں کے سوا کبھی کسی کو اس قسم کی اعانت کا علم نہ ہونے دیا۔ اس حسن عمل، اس تقویٰ اور اس ایثار کی شان آج کہاں ملتی ہے" [۲]

ان کی خدماتِ ملی کے کئی ایسے پہلو بھی تھے جو بوجوہ دنیا پر ظاہر نہیں ہو سکے اور اب ان کی تفصیلات کا مہیا کرنا بھی اگر ناممکن نہیں تو مشکل بہت ہو گیا ہے مثلاً :-

۱۔ تحریک جہاد اور یاغستان میں اس کے مرکز سے ان کا تعلق اور مجاہدین کی امداد اور اعانت کے لیے ان کی مساعی جمیلہ۔

۲۔ تحریک آزادیٔ وطن کے لیے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے انقلابی منصوبے سے ان کا تعلق جس کی تکمیل کے لیے انھوں نے اپنے نامور بیٹے مولوی محمد علی کو ہجرت کابل کی اجازت دی تھی۔

۳۔ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کابل میں جو خدمات انجام دے رہے تھے

---

[۱] روزنامہ انقلاب لاہور ۱۹ نومبر ۱۹۳۲ء ص ۳

[۲] ایضاً ۱۹ نومبر ۱۹۳۲ء ص ۳

اور حضرت شیخ الہند نے جن ملی مقاصد کے حصول کے لیے حجاز کا سفر اختیار کیا تھا۔ پنجاب میں ان کی تکمیل کی ذمہ داری کی تفصیلات۔ ان کی خدمات کے یہ پہلو ایسے تھے جنھیں ۱۹۴۲ء تک بھی کھول کر بیان کرنے کے لیے حالات سازگار نہ تھے۔ مولانا مہر صاحب مرحوم نے ان سطروں میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:

"اُن کی پُر عمل زندگی کے یہ اوراق ساری دنیا کے سامنے ہیں لیکن کئی اوراق ایسے بھی ہیں جو اب تک ان کے چند خاص رفیقوں کے سوا کسی کے سامنے نہ آئے اور پُوری ذمہ داری کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وُہ اوراق بھی دین و اسلامیت کی بہترین خدمات سے مزیّن ہیں۔ لیکن ان کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے اور نہ احوال و ظروف انھیں کھول کر بیان کرنے کے لیے فی الحال سازگار نظر آتے ہیں۔" [۱]

اس وقت احوال و ظروف اس کے لیے سازگار نظر نہ آتے تھے کہ ان دینی و اسلامی خدمات کے تمام پہلوؤں سے پردہ اٹھایا جاتا لیکن آج ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ان کے وُہ چند خاص رفیق بھی اس دنیا میں موجود نہیں ہیں جو مولانا مرحوم کی خدمات ملّی کے ان اسرار سے واقف تھے۔ بلاشبہ اگر ہماری جماعت اور اہلِ قلم قومی بے حسی کی شدید معصیت میں گرفتار نہ ہوتے اور قیام

---

[۱] روزنامہ انقلاب لاہور ۱۶ نومبر ۱۹۴۲ء ص ۳

پاکستان کے بعد توجہ کی جاتی تو نہ صرف مولانا عبدالقادر یا کسی خاص جماعت کی خدمات کے کچھ پہلو سامنے آتے بلکہ قومی تاریخ کا بہت بڑا سرمایہ فراہم ہو جاتا۔

؎ وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

مولانا ابوالکلام آزاد سے انھیں الہلال کے ابتدائی دور سے تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس خاندان نے ان کی دعوت پر اس وقت لبیک کہا تھا جب بہت کم لوگ متوجہ ہوئے تھے۔ بقول شورش کاشمیری:

"انھیں پنجاب میں مولانا آزاد کا نائب سمجھا جاتا تھا۔"

ان کے خاندان سے مولانا کے قریبی روابط کی بنا پر بعض لوگوں کو تو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ مولانا کی ان سے رشتہ داری بھی ہے بلاشبہ مولانا آزاد سے ان کا رشتہ تھا اور ایسا رشتہ تھا جس کے سامنے نسل و خون کے تمام رشتے ہیچ ہیں یہ رشتہ خدمتِ حق میں باہم معاونت کا تھا اور یہ رشتہ زندگی بھر رہا۔ سید سلیمان ندوی، نصراللہ خاں عزیز، شورش کاشمیری، عزیز ہندی وغیرہم نے مولانا آزاد سے ان کے قریبی روابط اور پنجاب میں مولانا کی نیابت کا تذکرہ کیا ہے۔ خود مولانا آزاد کے ایک رسالہ "اعلان" سے تحریکِ ہجرت کے زمانے میں پنجاب میں ان کی جانب سے نظم و بیعت کی اجازت کا پتا چلتا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے ان کے انتقال پر ان کی شخصیت و خدمات کا مرقع ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"پنجاب کے نامور عالم اور وکیل و مجاہد سیاسیات مولانا عبدالقادر قصوری عربی کے عالم، دینیات کے فاضل اور انگریزی سے

واقف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال والی تحریک سے ان کو ایسی دلچسپی تھی کہ اس کے لیے انھوں نے بہت کچھ نثار کیا۔ اپنے ایک صاحبزادے کو ایک طرف عالم بنایا اور دُوسری طرف کیمبرج کا گریجویٹ۔ اسی طرح اپنے دوسرے بیٹے کو بھی عربی وانگریزی کی تعلیم دلائی اور دونوں کو مع اپنی زندگی کے بہت سے سرمائے کے دعوت و تبلیغ اسلام کے کاموں کی نذر کر دیا جن کا سلسلہ ایک زمانے میں بمبئی سے لے کر مدراس تک جال کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ خلافت کی تحریک میں کامیاب وکالت کو خیرباد کہہ کر قومی و سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے اور اخیر تک اپنے عہد پر قائم رہے۔"

"حجاز کے وفدِ خلافت میں جو ۱۹۲۴ء میں جدہ تک جا سکا تھا۔ وُہ خاکسار کے ساتھ تھے۔ اگرچہ وفد کی صدارت برائے نام میرے نام تھی مگر ان کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ جدہ کے نہایت پُرخطر موقعوں پر جب جان کا خطرہ بھی تھا، وہ برابر ہمت بڑھاتے رہے۔ مثلاً، سوڈان، جدہ اور قاہرہ میں ہر جگہ وُہ ساتھ تھے۔"

"مرحوم مسلکاً اہلِ حدیث تھے۔ نہایت دین دار، متواضع،

ملنسار، پابند وضع، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصانیف کے بڑے شائق تھے اور انہی کی تحقیقات پر ان کا عمل تھا۔ خلافت حجاز اور کانگریس میں بیش از بیش حصہ لیا اور اس عمر میں بھی جو غالباً اسی کے قریب ہو گئی وہ اپنے جذبات کے لحاظ سے ایسے ہی جوان تھے۔ ادھر سیاسیات کی عملی تحریکوں سے کنارہ کش تھے۔“ ؎۱

شورش کاشمیری صاحب نے ان کی شکل اور شمائل کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

”آخر عمر میں سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور تمام وقت یاد اللہ میں بسر کیا۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ بلکہ تہجد گزار تھے۔ شرعی صورت، اُجلی داڑھی، نکلتا ہوا قد، روشن آنکھیں، لہجے میں علم اور زبان میں شرافت۔“ ؎۲

مولانا نصر اللہ خاں صاحب عزیز نے نہ صرف ان کے بلکہ اُن کے پورے خاندان کے سنت سے شغف اور اس پر عمل کی خوبی کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”مولانا عبد القادر اہل حدیث مسلک کے پابند تھے۔ ان کا سارا گھرانہ اہل حدیث مسلک کا نہ صرف معتقد بلکہ اس کی جزئیات

؎۱ یادِ رفتگاں۔ کراچی ۱۹۵۰ء ص ۲۷۱-۲۷۰

؎۲ ہفت روزہ چٹان لاہور ۱۹۵۳ء

تک پرسختی سے عامل تھا۔ ؎

مولانا قصوری اور ان کے خاندان کی اس خوبی کے بعد دین داری اور تقویٰ کی اور کون سی خوبی رہ جاتی ہے جس کا ذکر کیا جائے۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۴۲ء کی شام کو پونے پانچ بجے لاہور میں اپنی جان جان آفرین سپرد کی۔ میت کو قصور لے جایا گیا اور وہیں تدفین عمل میں آئی سید صاحب کے اندازے کے مطابق انتقال کے وقت ان کی عمر اسّی برس کی تھی۔

؎ ہفت روزہ چٹان، ۱۷ر نومبر ۱۹۶۹ء ص ۱۰

مولانا محی الدین قصوری

مولانا محی الدین قصور کے ایک اہل حدیث خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد مولانا عبدالقادر قصوری برصغیر پاک و ہند کے مشہور دینی و سیاسی رہنما تھے۔ مولانا موصوف نے بھی گراں قدر دینی، سیاسی، تعلیمی اور اصلاحی خدمات انجام دی ہیں اور تحریک استخلاص وطن کے سلسلے میں متعدد بار نظر بندی، گرفتاری اور قید و بند کے مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔

مولانا آزاد سے انھیں بڑی عقیدت ہے۔ مولانا کو بھی ان سے بھی تعلق خاطر تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں جب مولانا رانچی میں نظر بند تھے، ان کی گرفتاری کی خبر سنی تو بے قرار ہو گئے، لکھتے ہیں:

"ان تمام ایام جلا وطنی میں یہ پہلا دن ہے کہ اس واقعے کے سننے سے دل کو مضطر اور دماغ کو پراگندہ پاتا ہوں ... عزیز موصوف بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے خصائل ایمانی و جوش اسلامی و ایثار اللہ و فی اللہ کے اعتبار سے عہد سلف کے واقعات زندہ کر دینے والا ہے۔

اور علی الخصوص اس عزیز کے طلب صادق اور استعداد
کامل سے تو اپنی چند در چند امیدیں وابستہ تھیں" [۱]

۱۹۲۱ء کی ایک تحریر میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

"یہ (مولانا محی الدین قصوری) اور ان کا پورا خاندان
بیس برس سے نیشنل سروس میں ہر طرح کی قربانیاں دیتا
رہا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں جن چند خاص خاص آدمیوں
نے میری پکار پر لبیک کہا تھا ان میں یہ اور ان کا خاندان
بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس درجہ ان کا خیال ہے" [۲]

"تبرکات آزاد" میں مولانا موصوف کے نام مولانا (آزاد) کے خطوط
مولانا کے تعلق خاطر کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔

مولانا سے انھیں جو محبت تھی اس کا اعتراف خود مولانا علیہ الرحمہ
نے بھی کیا ہے۔ تبرکات کے پہلے خط میں شکایت تغافل کے جواب میں
لکھتے ہیں :

آپ نے میرے تغافل کی شکایت کی ہے۔ تغافل کا تو اقرار
نہیں کر سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جب کبھی میں نے
آپ کے اور اپنے معاملے پر غور کیا ہے۔ یقین کیجئے کہ ہمیشہ
خود میرے قلب نے مجھے ملامت کی ہے۔ آپ کی محبتوں

---

[۱] کاش اس شخص کے بارے میں علم ہو سکتا کہ وہ کون خوش نصیب تھا

[۲] ص ۷۵ تبرکات آزاد، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ۱۹۵۹ء کتاب منزل لاہور

کا میری جانب سے عشر عشیر بھی حق ادا نہ ہوا۔ میں خود اس کا معترف ہوں اور متمنی ہوں کہ کاش بقیہ زندگی میں کچھ تلافی کر سکوں لیکن مشکل یہ ہے کہ محبت کی کوتاہیاں حد تلافی و مکافات سے مافوق ہیں۔ ہر کوتاہی کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن محبت کی کوتاہی کی تلافی ممکن نہیں۔ مجھ سے علاقہ رکھنے والوں میں صرف ایک شخص ہے جس نے غالباً آپ سے بھی زیادہ مصائب برداشت کیے۔ باقی اور سبھوں سے زیادہ آپ کے لیے اپنے اندر غم و اندوہ پاتا ہوں اور دائمی اضطراب رکھتا ہوں۔

روزنامہ اقدام کلکتہ

ایک مدت تک کلکتہ میں مولانا کے بہت قریب رہے۔ ۱۸ر دسمبر سے ۱۰ر فروری ۱۹۲۶ء تک کلکتہ سے ایک روزنامہ اقدام کے نام سے مولانا کے زیر ہدایت نکالا جو کبھی روزانہ اور کبھی دوسرے تیسرے روز نکلتا تھا۔ اس کے کل ترین پرچے نکلے جو مولانا غلام رسول مہرؔ کی عنایت سے راقم السطور کی نظر سے گزرے ہیں۔ ۱۹۳۰ء کے بعد دہلی میں مولانا کی شراکت میں پریس لگایا لیکن یہ کام منفعت بخش ثابت نہیں ہوا اس لیے بند کرنا پڑا۔

مولانا محی الدین، ان کے والد مولانا عبدالقادر اور چچا مولانا عبداللہ مولانا علیہ الرحمۃ کے ہاتھ پر بیعت تھے اور پنجاب میں تحریک ہجرت اور تحریک نظم جماعت کے کاموں کے لیے بیعت اور تعلیم و ارشاد کے

مجاز و ماذون تھے۔

مولانا قصوری نے دینی و ملی مسائل پر نہایت بیش قیمت مضامین لکھے ہیں اور کئی کتب و رسائل کے مصنف ہیں۔

۱۹۶۳ء میں لاہور میں ان سے ملاقات کا شرف راقم السطور کو حاصل ہوا تھا اور دیر تک مولانا مرحوم کے فضائل و محامد کا تذکرہ فرماتے رہے میری اس موقع پر ان سے یہ دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات میں وہ خاموش رہے تھے اور جب میں نے مولانا آزاد سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا تو شاید وہ کسی سوچ میں پڑ گئے تھے، پھر جب اسی روز ان کی ملاقات محترم مولانا محمد حنیف ندوی سے ہوئی اور اس خاکسار کا تذکرہ آیا اور انھوں نے بتایا کہ میں واقعی مولانا علیہ الرحمہ کی محبت و عقیدت میں مخلص ہوں تو دوسری ملاقات میں وہ محبت و شفقت سے پیش آئے اور اتنی خاطر اور مدارات کی کہ مجھے ندامت محسوس ہونے لگی۔ پھر ان سے مراسلت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

اس وقت ان کی عمر[1] پچھتر برس سے زیادہ ہی ہوگی۔ نہایت متقی، پرہیزگار بلند اخلاق و پاکیزہ سیرت اور متواضع بزرگ ہیں۔

---

[1] اب جبکہ ان سطروں پر نظر ثانی کر رہا ہوں تو وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے

سید تراب علی شاہ راشدی

جامع حیثیات شخصیت

سندھ میں راشدی سلسلے کے مشائخ اپنی دینداری، پاکبازانہ زندگی، اپنے اخلاص وعمل اور زہد و ورع کے لیے ہی شہرت نہیں رکھتے بلکہ وہ عوام کی تعلیم و اصلاح رسوم و بدعات کے انسداد، اسلامی تعلیمات و افکار کی تبلیغ و اشاعت، احیائے کتاب و سنت کے لیے مساعی اور اپنے علمی مزاج اور سیاسی خدمات کے لیے بھی مشہور ہیں۔ اس سلسلے کے بزرگوں میں سے دورۂ آخر کے ایک بزرگ حضرت پیر سید تراب علی شاہ علیہ الرحمہ تھے وہ اپنے علم و عمل، سیرت و اخلاق، اور نظر و بصیرت اور خدمات دینی و سیاسی میں اسلاف کا کامل نمونہ تھے۔ ان کا تعلق اگرچہ سندھ کے صوفیا ومشائخ سے تھا لیکن اسلامی علوم وفنون میں بھی وہ ایک یگانہ حیثیت اور اپنے عہد کے سیاسی رہنماؤں میں بھی ایک امتیازی شان کے مالک تھے۔

ؔ۵ پیر سید تراب علی شاہ کے اذکار اور سیرت و خدمات میں سید علی محمد راشدی کا ایک نہایت مفصل مضمون سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد کے سہ ماہی علمی مجلہ مہران شمارہ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ زیرِ نظر مضمون کی تالیف میں اس سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

سندھ کی تاریخ خواہ تصوف کی ہو، خواہ تہذیب اور علوم اسلامی کی تعلیم و اشاعت کی ہو، خواہ سیاسی تاریخ ہو ان کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ حضرت سید تراب علی شاہ مرحوم و مغفور جنھیں لوگ محبت سے "شاہ سائیں" کہتے تھے، سندھ کے ان اعاظم رجال اور نفوس قدسیہ میں سے تھے جن کی سیرت کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ محض ایک خطۂ زمین اور اینٹ اور گارے سے تعمیر شدہ شہر نہیں، سندھ نام ہے ایک تہذیب کا، سندھ نام ہے سچائی اور حق پرستی کی ایک روایت کا، سندھ نام ہے وضع داری، وسیع النظری اور فراخ دلی کا، سندھ نام ہے شرافت اور نیک نفسی کا، سندھ انسانی سیرت کے اس حسن و جمال کا نام ہے جس کا خمیر شرم و حیا، غیرت و خودداری اور عزت نفس و قوم سے تیار ہوا ہے۔

مرکز علم و ہدایت

میں نے ان کی دولت کے قصے زبان زد خاص و عام نہیں پائے، میں نے ان کے سیاسی اقتدار کا کوئی دلربا افسانہ نہیں پڑھا میرے علم میں ان کی حکام رسی کا بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں جسے ان کی کرامت قرار دوں مجھے ان کی ریاست دنیوی کی حدود کا بھی علم نہیں لیکن ان کے پاس اخلاص و سیرت کا ایک ایسا خزانہ تھا جس کا ایک شمہ شہنشاہ وقت نہ پاکر محتاج وقت ہوتا ہے، انھیں علوم و معارف اسلامیہ میں نظر و بصیرت کی شہنشاہی حاصل تھی جسے نہ پاکر کوئی صاحب

ثروت بھی اپنی تہی دستی کا داغ دامن سے نہیں مٹا سکتا وہ ایمان وایقان کا ایک چشمۂ شیریں تھے جس پر تشنہ کامانِ ایمان وعرفان کا ہجوم تھا۔ وہ عمل صالح کی ایک شمع فروزاں تھے اور طالبانِ حق وصداقت ان پر پروانوں کی مانند قربان ہو رہے تھے ان کی عظمت کی اندازہ شناسی کے لیے اس بنیاد کی تلاش بے سود اور محض بے کار ہوگی جس پر دنیا کی عام عظمتوں کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ ہمیں ان کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے نئے پیمانہ ہائے فکر ونظر کی تلاش کرنی چاہیے۔ بلکہ عظمتوں کی اندازہ شناسی کے لیے حضرت شاہ سائیں کی عظمت سے نئے پیمانے اور اصول ومعیار وضع کرنے چاہئیں۔

وضع داری کا مجسمہ

دنیا نے بڑے لوگوں کے حلقۂ احباب اور وابستگانِ دامن میں بلند کلاہ لوگوں ہی کو تلاش کیا ہے خود بڑے لوگوں نے بھی اپنے گرد اصحاب طرۂ و دستار کے مجمع ہی کو پسند کیا ہے۔ بلاشبہہ حضرت شاہ سائیں کے ارد گرد اصحابِ علم وفضل کی کمی نہ تھی، ان کے وابستگانِ دامن میں اہل ثروت بھی تھے لیکن انھوں نے کبھی اونچے طرے اور سیم وزر سے بھرے دامن کی طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالی۔ انھیں جس چیز کی تلاش رہتی تھی اور آنکھیں جس چیز کو دیکھنے سے ٹھنڈک پاتی تھیں وہ علم ونظر کی دولت اور اخلاص ومحبت کی پونجی تھی اور یہ لازوال شے انھیں پٹھان نانبائی میں ملتی یا بوڑھے ٹانگے والے میں، وہ اس کے قدرشناس بھی تھے اور قدرداں

مربّی و معلم سیاست

انگریزوں سے اور ان کے بہی خواہوں اور کارندوں سے انھیں شدید نفرت تھی اور وہ نہ صرف ان سے ملنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ انھیں دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ ان کا کسی انگریز سے ملنے کے لئے جانے کا تو سوال ہی خارج از بحث ہے وہ اس کے بھی روادار نہ تھے کہ کوئی انگریز ان سے ملنے کے لئے ان کے یہاں آئے۔ کہیں آتے جاتے بھی کسی انگریز پر نظر پڑ جاتی تو منہ دوسری طرف پھیر لیتے۔ انگریزوں کے خلاف لوگوں کا مزاج بنانے، لوگوں میں نفرت پیدا کرتے اور آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں حصہ لینے کے لیے لوگوں میں ایک جذبہ بے پناہ پیدا کر دینے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ وہ اپنے منتسبین کی سیاسی تعلیم و تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتے تھے۔ سید علی محمد راشدی صاحب نے ان کی وضع داری کے سلسلے میں ایک تانگے والے سے ان کے تعلقات کا قصہ بیان کیا ہے۔ یہ قصہ دلچسپ اور سبق آموز بھی ہے لیکن میں اس واقعے سے جس چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ شاہ سائیں کی سیرت، فکر اور طریق تعلیم ہے راشدی صاحب لکھتے ہیں:

> لاڑکانہ میں ایک بوڑھا چیدھا تانگے والا تھا۔ تانگہ ایسا تھرڈ کلاس کہ بیٹھتے ہوئے شرم محسوس ہو، گھوڑا ایسا مریل کہ دیکھیں تو رحم آئے جب تھک جاتا تو بیچ سڑک پر حوائج ضروری پوری کرنے کے بہانے سے کھڑا ہو جاتا۔ چابک کا جواب لاتوں سے دیتا، لگام پکڑ کر دو قدم آگے کھینچو تو چار قدم

پیچھے ہٹ جاتا۔ کچھ اس کی صحت کا تقاضا تھا۔ کچھ مزاجاً ضدی واقع ہوا تھا، اس پر اس کے موڈ کا معاملہ۔ موڈ نہ ہوتا تو چلنے سے صاف انکار کر دیتا۔ نتیجتاً ہمیشہ سواری ہی کو اس کی مرضی کا لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن شاہ سائیں کی دوستی اس تانگے والے سے بہت پرانی تھی۔ انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ اس سے تعلقات اور وضع داری میں فرق آئے چنانچہ جب بھی وہ لاڑ کانہ آتے تو اسی سڑیل تانگے میں ہر کہیں آتے جاتے۔"

راشدی صاحب لکھتے ہیں:

"ایک دن میں اور شاہ سائیں اسی تانگے میں سوار تھے گھوڑا چلتے چلتے اپنی روایت اور عادت کے مطابق آدھے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ شاہ سائیں نے حکم دیا کہ تانگے سے اتر جاؤ جب تک کہ گھوڑا بخوشی چلنے پر آمادہ نہ ہو۔"

راشدی صاحب بیان کرتے ہیں:

"حکم کی تعمیل تو ہو گئی لیکن میری زبان سے گھوڑے کی شان میں چند نامناسب الفاظ نکل گئے جو اگرچہ انھوں نے پسند نہیں کیے لیکن وہ مسکراتے رہے۔ جس دن کا یہ واقعہ ہے وہ کلکٹر سے وڈیروں کی ملاقات کا دن تھا اور وڈیرے نہایت کروفر اور تمکنت سے نہایت شاندار اور عمدہ گھوڑوں

کے تانگوں میں کلکٹری کی طرف جا رہے تھے کوئی نظر حقارت اس تانگے اور گھوڑے کی طرف بھی ڈال لیتا تھا۔ تانگہ شکستگی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا اور گھوڑا مریل پن میں اپنی مثال آپ تھا۔ شاہ سائیں نے جھوٹے وقار کے ان پرستاروں کو عزت وجاہ کی اس تگ ودو میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر کہا:

کیا سمجھتے ہیں مسٹر راشدی! ان وڈیروں سے تو ہمارا یہ گھوڑا زیادہ باحمیت اور خوددار ہے۔ اپنی مرضی کے خلاف قدم نہیں اٹھاتا۔ کسی کی مجال نہیں جو اسے اس کی مرضی کے خلاف چلنے پر مجبور کرے۔ یہ کسی کی زبردستی اور اثر واقتدار کی پرواہ نہیں کرتا لیکن اگر ان عزت خواہ اور جاہ پرست وڈیروں کو کلکٹر کی طرف سے حکم ملے کہ تانگوں میں گھوڑوں کی جگہ جُت کر سرکاری سواری کھینچو تو ان میں سے ایک نہیں جو اس گھوڑے کی طرح بیچ راستے میں چلنے سے رک جائے' تانگے کو کھینچنے سے انکار کر دے اور سرکار سوار کے ایک لات رسید کرے"!

شاہ سائیں نے پھر راشدی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"راشدی صاحب! آپ اِس گھوڑے کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ خدارا ذرا انصاف سے کام لیں اور بتائیں کہ کون آزاد

ہے، کس نے آزادی کی حقیقت کو پہچانا ہے اور کون
زیادہ عزت کا مستحق ہے یہ گھوڑا یا وہ اشرف المخلوقات"؟

انگریز دشمن

انگریز سے نفرت حضرت شاہ سائیں کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں، پابندیاں گوارا کیں لیکن ان پابندیوں کو اٹھا لینے کے لیے نہ کبھی کسی سے کوئی درخواست کی نہ چند لمحوں کے لیے کسی بڑے یا چھوٹے افسر سے ملنا گوارا کیا۔ سید علی محمد راشدی صاحب نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ شاہ سائیں کے بلوچستان میں داخلے پر پابندی تھی اور وہ بلوچستان جانا چاہتے تھے۔ راشدی صاحب کے جد مرحوم پیر شاہ راشدی کو علم ہوا تو انھوں نے سندھ کے کمشنر سے ذکر کیا اس نے کہا کہ یہ پابندی ابھی ختم ہوسکتی ہے بشرطیکہ آپ حضرت شاہ سائیں کو چند منٹ کے لیے یہاں لے آئیں میں ان سے ملاقات کا متمنی ہوں لیکن جب انھوں نے حضرت شاہ سائیں سے کمشنر کی اس خواہش کا تذکرہ کیا تو حضرت نے فرمایا:

"میرے سرکار! اگر یہی کام ہم کر سکتے تو یہ پابندی ہی کیوں ہوتی؟ ہمیں ایسی آزادی اور ایسی سیر مطلوب نہیں جس کے لیے اپنی زندگی کا اصول توڑنا پڑے۔"

سید علی محمد راشدی صاحب کہتے ہیں کہ دادا مرحوم کو امید تھی کہ وہ شاہ سائیں کو اس کے لیے آمادہ کرلیں گے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے۔ انھوں نے واپس جاکر نرم اور مناسب الفاظ میں اِس ملاقات کے امکان سے

سے معذرت کر دی۔ لیکن کمشنر جو شاہ سائیں کی سیرت سے واقف تھا وہ اس جواب اور معذرت سے مطمئن نہیں ہوا اس نے یہ اصرار دادا مرحوم کو شاہ سائیں کے اپنے الفاظ سنانے پر مجبور کیا۔ جب اس نے شاہ سائیں کے ادا کیے ہوئے الفاظ سنے تو بہت خوش ہوا اور کہا،

" ایسے با اصول شخص کے لیے ہمارے دلوں میں عزت ہونی چاہیے۔ پیر تراب علی شاہ سے ہمارا سلام کہنا اور بتا دینا کہ ان پر سے پابندی اٹھا لی گئی وہ بلوچستان یا جہاں وہ جانا چاہیں جا سکتے ہیں۔"

سیاسی رہنما

برٹش حکومت سے موالات کے معاملے میں وہ بہت متشدد تھے۔ وہ اس حقیقت کے واقعی اندازہ شناس تھے کہ جب تک انگریز ہندوستان سے نہ نکلے گا عالم اسلام کو برٹش استعمار کے عفریت سے نجات نہ ملے گی اور اسلام اور مسلمانوں کی سلامتی کو جو خطرہ درپیش ہے وہ کبھی دور نہ ہوگا۔ اسی لیے انھوں نے ہر اس تحریک کا ساتھ دیا، اس کے کارکنوں کی ہمت بندھائی اور ان کے رہنماؤں سے تعاون کیا جن کی مساعی انگریزوں کے خلاف تھیں اور جو برٹش استعمار کے عفریت سے ملک کو نجات دلانا چاہتے تھے جمعیت علمائے ہند، مجلس خلافت اور ترک موالات، سول نافرمانی اور ہجرت کی تحریکوں میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر نہ صرف حصہ لیا بلکہ سندھ میں ان کی رہنمائی کی۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۶ء تک سندھ میں آزادی کی جتنی بھی تحریکیں اٹھیں ان میں حضرت شاہ سائیں یا ان کے فیض یافتگان کا بڑا

راست حصہ رہا ہے۔ ان کے ساتھیوں میں وقت کے تمام انقلاب پسند اور حریت پسند عناصر موجود تھے۔ ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے حکم سے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے کابل کا سفر اختیار کیا تو حضرت شاہ صاحب نہ صرف مولانا سندھی کے ارادے سے باخبر تھے بلکہ وہ ان کے سفر کے منصوبہ بندوں میں سے تھے۔ حضرت شاہ صاحب کا وجود گرامی اسلامی اور آزادی کی تحریکات میں مرکزیت کا حامل تھا۔ سید علی محمد راشدی لکھتے ہیں:

"سندھ میں تحریک خلافت کو پھیلانے اور اسے مقبول بنانے میں ان کا بڑا حصہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ انہیں کے ساتھی، عزیز، دوست، مرید اور معتقد تھے جنہوں نے پہلی بار سندھ میں سندھ کے عام پیروں اور وڈیروں کی روایتوں کو توڑا۔ لاڑکانہ ضلع انہیں کی وجہ سے سندھ میں تحریک خلافت کا مرکز بنا، انہیں کی کوششوں سے لاڑکانہ میں پہلی خلافت کانفرنس ہوئی اور ہجرت کی تاریخی تحریک میں سندھ میں سب سے زیادہ منظم کام ہوا اور مہاجرین کی پہلی اسپیشل ٹرین لاڑکانہ ہی سے روانہ ہوئی۔"

خلافت کانفرنس لاڑکانہ

سید علی محمد راشدی صاحب نے لاڑکانہ میں جس خلافت کانفرنس کا تذکرہ کیا ہے یہ وہی خلافت کانفرنس تھی جو مارچ ۱۹۲۰ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے زیر صدارت محترم جی ایم سید صاحب کی کوششوں سے منعقد ہوئی

تھی۔ محترم جی ایم سید صاحب اپنی زندگی اور افکار میں جن صوفیا اور علما و مشائخ سے متاثر رہے ہیں اور جن کی سیرت اور تعلیمات نے ان کی زندگی میں گہرے نقوش ثبت کیے اور میدان سیاست میں ان کی رہنمائی کی ہے ان میں شاہ سائیں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔

صاحب قلم

مریدین و معتقدین کی ذہنی و فکری تعلیم و تربیت اور عملی و سیاسی ہنگامہ خیزیوں کی وجہ سے شاہ سائیں کی تصنیفی و تالیفی صلاحیتوں کو زیادہ ابھرنے اور ایک مصنف اور انشا پرداز کی حیثیت سے علمی و ادبی دنیا میں انھیں شہرت پانے کا موقع نہیں مل سکا لیکن محترم راشدی صاحب کے بقول وہ اعلیٰ پائے کے صاحب قلم بھی تھے۔ ان کی تحریر مولویانہ قسم کی اور روکھی پھیکی نہ ہوتی تھی۔ عبارت سلیس، دلچسپ اور بڑی جاندار ہوتی تھی۔ وہ اپنے مضمون میں اپنی معلومات سے قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ ان کی تحریر اختصار و اجمال کا نہایت عمدہ نمونہ ہوتی تھی۔ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی سمو دینے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ وہ طوالت کو عام طور پر پسند نہ کرتے تھے البتہ اگر کبھی طبیعت میں جوش پیدا ہو جاتا تو ان کے الفاظ ذہن و دماغ پر بجلی بن کر گرتے تھے اور جملوں کی بندش، تشبیہوں اور استعاروں کے برجستہ اور اشعار کے برمحل استعمال نیز طرز بیان کی دل آویزی اور پر جوش انداز سے غنیم افکار پر اس زور اور شدت کے ساتھ حملہ کرتے تھے کہ عرصۂ افکار کو بالکل تنگ کر دیتے تھے۔ قلم کی معمولی جنبش سے مخالف کے بڑے سے بڑے

فکری حملے کو بے اثر کردیتے تھے۔

شائق مطالعہ

شاہ سائیں مطالعے کے بہت شوقین تھے۔ ذاتی کتب خانہ نہایت بلند پایہ اور نادر و نایاب عربی، فارسی، سندھی اور اردو کتابوں پر مشتمل تھا۔ سفر و حضر میں کوئی نہ کوئی کتاب ان کے پاس ضرور رہتی تھی۔ امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم اور علمائے متاخرین میں مولانا ابو الکلام آزاد سے وہ بہت متاثر تھے اور ان کی کوئی نہ کوئی کتاب ہمیشہ زیر مطالعہ رہتی تھی۔ سید علی محمد راشدی صاحب کو مولانا آزاد مرحوم کا "تذکرہ" عنایت فرماتے ہوئے ہدایت کی تھی" اس کتاب کو بار بار پڑھتے رہنا" رسائل و اخبارات میں الہلال و البلاغ کی دعوت و فکر اور زبان و بیان کے بہت گرویدہ تھے۔ مدینہ بجنور کی حقیقت پسندانہ پالیسی اور اس کی بے لاگ تنقیدوں اور تجزیوں سے بہت متاثر تھے اور سیاسی کارکنوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ان کا مطالعہ بہت ضروری خیال کرتے تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی

شاہ سائیں کو مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ ان کی انقلابی فکر ان کے جذبۂ عمل، ان کی قربانیوں اور ان کی عزیمت و استقامت سے بہت متاثر تھے۔ اور ان کی جلاوطنی کے خاتمے، اور انھیں ملک واپس لانے کے لیے بے چین تھے ۱۹۳۶ء میں وفات سے چھ ماہ پہلے سید علی محمد راشدی صاحب سے ان کی آخری ملاقات ہوئی تو یہی ہدایت کی کہ انھیں مولانا سندھی کی واپسی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ راشدی صاحب اس

زمانے میں سیاست سے الگ ہو کر اپنے گاؤں میں خاموشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ شاہ صاحب ان کے گاؤں گئے اور جہاں انھیں اور نصیحتیں کیں وہاں انھیں سیاست میں دوبارہ حصّہ لینے کی تلقین کی اور یہ بھی فرمایا:

"مولانا عبید اللہ سندھی کا ہمارے اوپر ایک فرض ہے میں نے بہت کوشش کی کہ سندھ کی پہلی وزارت کے ذریعے یہ فرض ادا کروں۔ مگر میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔۔۔ عبید اللہ سندھی غریب کو ہماری اسکیم کے مطابق ملک بدر ہونا پڑا لیکن ہم آج تک ان کے وطن واپس آنے کی بندش کو دور نہیں کرا سکے۔ افسوس ہے کہ ہمارے اپنے آدمی ابھی تک اپنے ہی لوگوں سے انگریزوں کا حساب کتاب لے رہے ہیں۔ مولانا سندھی جلا وطنی میں دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں اور ہم یہاں عیش کر رہے ہیں۔ مولانا سندھی اب بوڑھے بھی ہو گئے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے وطن واپس آنے کی پابندیوں کو دور کرائیں اور ان کی زندگی کے اس آخری دور میں انھیں واپس لائیں اور وطن سے دوری اور غربت کے احساس کو ان کے دل سے مٹا دیں۔ میں ذاتی طور پر بھی اپنے آپ کو ان کا مقروض سمجھتا ہوں۔"

راشدی صاحب لکھتے ہیں:

~~شاہ صاحب پیر کے گاؤں سے روانہ ہوتے تو میں بھی~~

کراچی چلا آیا۔ اتفاقاً چند دنوں میں سندھ کی یہ وزارت ختم ہوگئی اور خان بہادر اللہ بخش کی نئی وزارت نے مولانا عبیداللہ سندھی کی ضمانت دیگر بندش ہٹوا کے اور انھیں واپس لانے کا انتظام کر دیا۔ میں نے شاہ سائیں کی خدمت میں تار دیا کہ آپ کے حکم کی تعمیل ہوگئی۔ تار پہنچنے کے بعد چوتھے دن آپ نے رحلت فرمائی۔ اِنّا لِلّٰہ و انا اِلیہ راجعون۔ ۵

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خم خانہا کردند و رفتند

پیر اور سیاست

حضرت شاہ سائیں خود ایک بہت بڑے پیر تھے لیکن وہ پیروں کی رسمی و روایتی زندگی کے سخت مخالف تھے۔ وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ اس رسمی اور روایتی نظام سے ملت کی اصلاح و تربیت کا کام کبھی نہیں لیا جاتا اس لحاظ سے یہ ایک بوسیدہ اور از کار رفتہ نظام ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ اس نظام کو تحریک آزادئ وطن کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ سندھ کی سماجی زندگی میں پیری مریدی کے نظام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں اِس نظام کو مٹانے میں اپنی صلاحیتوں کو ختم کرنے اور اسے غیر موثر بنانے کی کوششوں کے بجائے اس کی اصلاح کرنی چاہیے تھی۔

ان کا خیال تھا کہ اگر پیروں کی اصلاح کر دی جائے تو وہ ملک کی آزادی اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت دینی و سیاسی میں ایک نہایت موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر پیر صاحبان حالات و وقت سے متاثر ہوئے بغیر سیاسی و دینی معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی کریں تو مسلمان ایک عظیم قوت کی حیثیت سے سیاسی زندگی میں ملک کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ انھیں یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر پیران طریقت اور مشائخ عظام کو اسی طرح انگریزی حکومت استعمال کرتی رہی جس طرح رانی پور (ریاست خیرپور) کانفرنس میں ملک کی تحریک آزادی کے خلاف انھیں استعمال کیا گیا تھا تو وہ اپنی حیثیت اور وقار کو گنوا بیٹھیں گے۔ اور پھر وہ اسلامی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دینے سے بھی قاصر رہیں گے اور آزادیٔ وطن کی تحریک کے نقصان کے علاوہ سندھ کی سماجی زندگی میں ایک ایسا انتشار پیدا ہو جائے گا جس کے اثرات بہت دور رس ہوں گے۔ شاہ سائیں چاہتے تھے کہ پیران کرام اور مشائخ عظام اپنے مقام کو سمجھیں، اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں، اگر ان کے قدم کسی غلط راہ پر پڑے تو پھر قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ پھر ملت کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ اس کے لیے انھوں نے ایک تحریک شروع کی اور سب سے پہلے راشدی سلسلے کے مشائخ کی ایک جماعت "جمعیت الراشدیہ" قائم کی اور ایک ماہنامہ "الراشد" کے نام سے جاری کیا۔ سید علی محمد راشدی صاحب لکھتے ہیں:

شاہ سائیں محسوس کرتے تھے کہ انگریز سندھ میں پیروں کے

اثر و رسوخ کو آزادیٔ وطن کی تحریک کے خلاف استعمال کریں گے۔" رانی پور کانفرنس" نے شاہ سائیں کے خطرے کو صحیح ثابت کر دیا تھا، شاہ سائیں کا خیال تھا کہ ان سادہ لوحوں کو انگریز مداری بندر کی طرح نچائے گا۔ انھیں عوامی مصلحت اور مقاصد کے خلاف استعمال کرے گا پھر جب یہ رسوا اور بدنام ہو جائیں گے تو ہاتھ کھینچ لے گا۔"

"وہ محسوس کرتے تھے کہ دنیا تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے نئی نسل کے لوگوں میں روشنی آ رہی ہے، نئی نسل جب ان پیروں کو عوامی مفاد کے خلاف خدمت سرکار میں دیکھے گی تو وہ ان کے خلاف ہو جائے گی اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پیری مریدی کا یہ سارا نظام ختم ہو جائے گا اور سندھ کی سماجی اور مذہبی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو جائے گا جو کسی دوسری طرح پر نہ کیا جا سکے گا۔"

پیروں کی اصلاح کی کوشش

"پیروں اور مشائخ کو اس معصیت سے بچانے کے لیے انھوں نے جمعیت الراشدیہ کے نام سے اپنے سلسلے کے پیروں کی تنظیم کے لیے کوشش شروع کی۔ وہ چاہتے تھے کہ پیروں کو سرکار اور عام لیڈروں کے چکر سے نکال کر عوام کے قریب رکھا جائے اور آزادی کی جدوجہد اور عوامی زندگی میں ان سے کام لیا جائے وہ نہیں چاہتے تھے کہ پیر سرکاری دلال بن کر عوام سے اور سیاسی بصیرت سے بے بہرہ، خدمت قومی سے معطل

اور مریدوں کی صرف نذر کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیں۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے انھوں نے "الراشد" کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا۔ لیکن حالات ایسے تھے کہ مقاصد کی راہ روز بروز دُور ہوتی ہوگئی اور پیچیدگیاں بڑھ گئیں۔ تحریک کی ناکامی پر افسوس کرتے ہُوئے کہا کرتے تھے کہ اس فرقے کو تو بھیک کی عادت کھا گئی، بڑے اور سچے پیر انتقال کر گئے، ان کی جگہ پر گداگر بیٹھتے جا رہے ہیں۔ گداگروں کا کیا اخلاق ہو سکتا ہے یہ کسی دن بڑوں کی قبریں بھی بیچ دیں گے۔ جس طرح افراد کی زندگی کی ایک مہلت ہوتی ہے اور اسی طرح جماعتوں اور ملتوں کی زندگی اور موت واقع ہوتی ہے۔ اس فرقے نے بھی اپنی مہلت حیات پوری کر لی، اب اس پر موت طاری ہو چکی ہے اس سے زندگی اور زندگی کے اعمال کی توقع لاحاصل ہے اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔

مولانا آزاد اور شاہ سائیں

مولانا ابوالکلام آزاد سے شاہ سائیں کو خاص عقیدت تھی۔ مولانا نے جب "دارلرشاد" کے نام سے کلکتہ میں تعلیم کتاب و حکمت اور تربیت اسلامی کا ایک نظام قائم کیا تو شاہ سائیں نے بھی اپنے صاحب زادے پیر عبدالقادر شاہ مرحوم کو کلکتہ بھیجنے کا ارادہ کر لیا تھا اور مولانا آزاد کو اس سلسلے میں خط بھی لکھ دیا، لیکن ٹھیک اُن ہی دنوں مولانا کو کلکتہ سے اخراج کا حکم ہوا چونکہ پنجاب و یو پی کی حکومتیں اپنے اپنے صوبوں میں پہلے ہی ان کا داخلہ کو ممنوع قرار دے چکی تھیں انھیں مجبوراً صوبہ بہار کے ایک

چھوٹے سے قصبے رانچی میں مقیم ہونا پڑا، پھر وہیں حکومت نے انھیں نظر بند کر دیا۔ ان حالات میں دار الارشاد کا نظام تعلیم و تربیت ختم ہوگیا اور سید عبدالقادر شاہ کلکتہ نہ پہنچ سکے۔

جنوری ۱۹۲۰ء میں جب مولانا آزاد چار سال کی نظر بندی سے رہا ہوئے اور نظم جماعت کی تحریک شروع کی تو شاہ صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ راشدی سلسلے کے پیروں میں نظم پیدا کرنے کی کوشش "جمعیت الراشدیہ" کا قیام "الراشد" کا اجراء اور سندھ میں پیری مریدی کے نظام کی اصلاح اور ان کے ذریعے ملی مقاصد کے حصول کی سعی، پیروں کو عوام سے قریب آنے اور آزادیٔ وطن کے لیے کام کرنے کی دعوت مولانا آزاد کی دعوت نظم جماعت کے سلسلے کی مساعی تھیں۔

تحریک ہجرت اور نظم جماعت

سنہ ۱۹۲۰ء میں جب ہجرت کا مسئلہ سامنے آیا تو ضروری سمجھا گیا کہ ہندوستان سے ہجرت ایک نظم و ضبط کے ماتحت ہو اور جس طرح کہ یہاں انتشار و افتراق کی زندگی مسلمان بسر کر رہے ہیں ہجرت میں یہ صورت نہ ہو تمام مسلمان منظم اور متحد ہو کر ہجرت کریں اور رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک و معاون ہوں۔ اس سلسلے کے بہت سے مسائل ایسے تھے جن کا فیصلہ کرنا عام افراد امت کے لیے ممکن نہ تھا بلکہ یہ جماعت کا فرض تھا کہ وہ ان امور کا لحاظ کرے اور ہجرت کے باب میں مسلمانوں کی رہنمائی کرے۔ چوں کہ بیک وقت ہندوستان کے تمام مسلمان ہجرت نہیں

کر سکتے تھے اس لیے نہ ہجرت کے وجوب کا سب پر اطلاق ہو سکتا تھا۔ نہ ہجرت کرنے والوں ہی کو بیک وقت اس کی اجازت دی جا سکتی تھی۔ مولانا آزاد نے انھیں مہمات امور کی طرف ان سطروں میں اشارہ کیا ہے:

"واضح رہے کہ ہجرت کی جو صورت اس وقت ہندوستان میں درپیش ہے شرعاً اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ فرداً فرداً ہر شخص بطور خود نکل کھڑا ہو بلکہ ہجرت کے تمام اعمال جماعت کے ساتھ انجام پانے چاہییں۔ اس بات کا فیصلہ کرنا صاحبِ جماعت کا کام ہے کہ کس کس شخص کو فوراً ہجرت کرنا چاہیے اور کس شخص کی استعداد ایسی ہے کہ اس کا قیام اندرونی خدمات کے لیے مطلوب و مفید ہے نیز ہجرت کی جائے تو کس مقام پر اور کن حالات کے ساتھ کہ موجب ثمرات و برکات ہو، ہر شخص بطور خود ان امور کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔"[51]

اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک نظام ہجرت قائم کر دیا جائے۔ ایک صاحب علم و بصیرت اس کا امیر ہو اور ہجرت کی راہ میں قدم اٹھانے سے پہلے وہ تمام مسلمان جو ہجرت کرنا چاہتے ہیں، بیعت ہجرت کریں۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"اعمال ہجرت کا جو نمونہ اُسوۂ حسنۂ نبوت نے ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ یہ ہے کہ ہجرت سے مقدم ہجرت کی بیعت ہے۔ بغیر بیعت کے ہجرت نہیں کرنی چاہیے۔ پس ضروری ہے کہ جو لوگ ہجرت کریں، پہلے ہجرت پر بیعت کریں۔"[52]

اس سلسلے میں مرکزی حیثیت مولانا آزاد کی تھی۔ انھوں نے ہندوستان

---

۵۱ رسالہ "اعلان" سنہ ۱۹۲۰ء ص، ۷

۵۲ رسالہ "اعلان" سنہ ۱۹۲۰ء ص، ۷

کے مختلف صوبوں میں مختلف حضرات کو بیعت ہجرت کا مجاز قرار دیا تھا۔ سندھ میں حضرت شاہ سائیں کی شخصیت ماذون و مجاز تھی۔ مولانا لکھتے ہیں:

"جس طالب حق کو مجھ پر اعتماد ہو، اللہ کی راہ میں میرا ساتھ دے۔ بالفعل طریق عمل یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ توفیق عمل دے وہ فوراً اپنے عزم سے مجھے مطلع کریں یا حسب ذیل اصحاب سے مل کر تفصیلی ہدایات حاصل کریں:

مولانا عبدالقادر صاحب وکیل (قصور، ضلع لاہور)

مولوی محی الدین احمد صاحب بی۔ اے (قصور، ضلع لاہور)

مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی (امرتسر)

پیر سید تراب علی شاہ صاحب راشدی (لاڑکانہ، سندھ)

مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ایڈیٹر البیان (لکھنؤ)"[۵۱]

تحریک ہجرت اور سندھ

اس سلسلے میں سندھ برصغیر پاک و ہند کا واحد صوبہ تھا جس نے ہجرت کے سلسلے میں ایک نظم کے تحت قدم اٹھایا اور سب سے زیادہ اسی صوبے سے مسلمانوں نے ہجرت کی۔ تحریک ہجرت کی کامیابی اور اس میں نظم و ضبط کی خوبی کا سہرا حضرت شاہ سائیں کے سر تھا۔ انھوں نے سندھ میں باقاعدہ ہجرت کمیٹی کی تشکیل کی تھی۔ اس کے صدر وہ خود اور سکریٹری رئیس المہاجرین جان محمد جونیجو تھے۔ جو شخص ہجرت کا ارادہ کرتا، وہ اپنے ارادے سے ہجرت

---

۵۱ رسالہ "اعلان" ۱۹۲۰ء، ص ۸

کمیٹی کو مطلع کرتا۔ ہجرت کمیٹی اس کی رہنمائی کرتی تھی اور اس کے حالات و استعداد کے مطابق اسے مشورہ دیا جاتا تھا۔ تحریک ہجرت میں رئیس المہاجرین شاہ سائیں کے دست راست تھے۔ مہاجرین کا جو قافلہ جولائی ۱۹۲۰ء میں لاڑکانہ سے روانہ ہوا تھا مولانا جان محمد کو اس کا رئیس مقرر کیا گیا تھا۔ رئیس المہاجرین انھیں اسی نسبت سے کہا جاتا ہے۔ شاہ سائیں اور ان کے دست راست پیر سید علی انور شاہ راشدی مہاجرین کی اسپشل ٹرین کے ساتھ پشاور تک گئے اور انھیں الوداع کہا ۵

ایک مکمل انسان

حضرت سید تراب علی شاہ راشدی علیہ الرحمۃ تعلقہ قنبر (ضلع لاڑکانہ) کے ایک موضع علی خاں میں رہتے تھے۔ سندھ کے مشہور عالم دین مولانا غلام صدیق شہدادکوٹی کے نامور شاگرد تھے۔ سید علی محمد راشدی صاحب نے انھیں ایک "مکمل انسان" لکھا ہے۔ اسوۂ رسولؐ کا پیکر تھے اور اسم سامی حضرت رسالتمآبؐ اور سیرت طیبہ نبویؐ کے عاشق تھے

قرون اولیٰ کا مسلمان

لباس بہت معمولی پہنتے تھے۔ کھدر یا لٹھے کا کرتہ، شلوار یا تہہ بند استعمال کرتے تھے۔ دلائل الخیرات یا قرآن مجید ہمیشہ طویل یا مختصر سفر کے دوران میں ان کے گلے میں حمائل رہتا، ہاتھ میں ہمیشہ لاٹھی یا کلہاڑی رکھتے تھے۔ بلوچستانی وضع کی چپل پہنتے تھے۔ اپنے رہن سہن اور وضع و لباس میں سندھ بلوچ

---

۵ رئیس المہاجرین مرحوم جان محمد جونیجو، از ڈاکٹر نبی بخش خان، بلوچ، مہران، حیدرآباد [struck-through text] سوانح نمبر ص ۲۸۵

تہذیب و روایات کو پسند کرتے تھے۔ امراء کے مقابلے میں عوام سے
مل جل کر رہتے تھے۔ وہ عوام ہی کو قوم کا اصل سرمایہ سمجھتے تھے۔

قرنِ اولیٰ کا وہ مسلمان جو بیسویں صدی کے مسلمانوں کی تعلیم و ہدایت کے لیے دنیا کی پستیوں میں اتر آیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ وہ عظیم روح جو پورے ایک قرن تک مسلمانوں کی بے حسی اور بے عملی پر بے چین اور مضطرب ہو ہو کر انھیں ہدایتِ الٰہی کی طرف بلاتی رہی آخر اپنے آبائی موضع علی خاں (قنبر) میں آسودہ خاک ہو گئی۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

پیدائش اور تعلیم

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ کے مشہور مردم خیز قصبہ ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء میں مصر چلے گئے اور علامہ رشید رضا کے "مدرسہ دعوت وارشاد" میں داخل ہو کر علوم ادبیہ، تفسیر قرآن وغیرہ کی تحصیل کی۔

جہان اسلام کی ادارت

دوران تعلیم ۱۹۱۴ء میں ترکی کا سفر کیا اور چند دن تک "جہان اسلام" کو ایڈٹ کیا۔

"جہان اسلام" قسطنطنیہ سے اردو، عربی، ترکی تین زبانوں میں حکومت ترکیہ کی جانب سے انور پاشا کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ اس کے عربی اور ترکی حصے کے ایڈیٹر عمر رضا ایک مصری ادیب تھے۔ اردو حصے کو ابوسعید العربی الهندی، نامی ایک صاحب ایڈٹ کرتے تھے۔ ابوسعید سے ملیح آبادی کی ملاقات مصر میں ہوئی تھی اور ملیح آبادی کی پرجوش تحریروں سے وہ بہت متاثر ہوتے تھے۔ یہی ملاقات ملیح آبادی کے سفر ترکیہ کا سبب بنی۔ جہان اسلام ۱۹۱۳ء سے نکل رہا تھا ۱۹۱۴ء کے الہلال کلکتہ میں بہت دنوں تک اس کا اشتہار چھپتا رہا۔ جہان اسلام مولانا ملیح آبادی کے ایک پرجوش

مضمون کی بنا پر ہندوستان میں داخلہ بند ہوگیا۔

ملیح آبادی ابھی ترکی ہی میں تھے کہ جنگ عظیم اول کا اعلان ہوگیا اور بہت پرخطر حالات میں آخری جہاز سے وہ مصر واپس پہنچے۔

وطن کو واپسی

۱۹۱۸ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا ملیح آبادی ہندوستان واپس آئے۔ ملیح آبادی تحریک آزادیٔ وطن کے بہت پرجوش داعی اور انگریزوں کے بڑے کٹر دشمن تھے۔ اس کے لیے وہ مصر اور ترکی میں مشہور ہی نہیں بدنام رہے تھے۔ انگریزوں کی سی آئی ڈی ان کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ ان کے ہندوستان واپس آنے سے پہلے مصر میں ان کے سیاسی مشاغل اور انگریز دشمنی کے متعلق سی۔آئی۔ڈی کی رپورٹ پہنچ چکی تھی۔ انگریزوں کا ابھی جنگ سے پیچھا نہ چھوٹا تھا اور انگریز اور سامراج کے ایسے کٹر دشمن کو آزاد چھوڑ دینا خطرے سے خالی نہ تھا حکومت کسی خطرے کو مول لینے کے لیے تیار نہ تھی اور اس لیے ہر وقت یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ وہ گرفتار ہو جائیں گے۔

ندوے میں دوبارہ داخلہ

اس لیے کچھ تو عزیزوں کے اصرار سے مجبور ہو کر اور کچھ اس وجہ سے کہ ملک کے تمام سیاسی اکابر اور رہنما ملک اور بیرون ملک کی جیلوں میں قید تھے یا نظر بند تھے ان حالات میں کوئی تحریک شروع نہ کی جا سکتی تھی۔ یہ مناسب سمجھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دوبارہ داخل ہو کر تکمیل علمِ حدیث کی آرزو پوری کر لی جائے۔ گرفتاری سے بچنے اور اس عارضی وقفے کو گذارنے کا

اس سے زیادہ مناسب اور مفید طریقہ دوسرا نہ تھا۔ اس طرح حکومت اور پولیس بھی مطمئن ہو جائے گی اور تکمیل علم حدیث کی دلی آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔ حالانکہ ندوہ میں داخلے کے باوجود نہ توان کے سیاسی مشاغل جو بھی ان حالات میں جاری رہ سکتے تھے ختم ہوئے اور نہ پولیس مطمئن ہوئی۔ وہ داخل ہوئے تو سی آئی ڈی سے تعلق رکھنے والے ایک طالب علم کا اضافہ بھی ہوا جو ان کی شب و روز نگرانی کرتا تھا۔ ڈیڑھ دو سال سے سی آئی ڈی اور مولانا ملیح آبادی میں آنکھ مچولی ہوتی رہی لیکن وہ گرفتاری سے ضرور بچ گئے ان کی دلی مراد بھی پوری ہو گئی اور حدیث کی انھوں نے تکمیل کر لی لیکن پولیس کی نظر میں ان کی خطرناکیوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا لیکن جنگ عظیم کے خاتمے کے ساتھ ہی ملک کے تمام سیاسی رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا اس لیے ان کی بھی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔

مولانا آزاد سے تعارف

سیاسی رہنمائی کے لیے وہ وقت کے تمام مسلمان اکابر کے قریب ہوئے لیکن کسی سے وہ مطمئن نہیں ہوئے اور کوئی ان کی اولوالعزمیوں اور برق رفتاریوں کا ساتھ نہیں دے سکا۔ لبتہ مولانا آزاد سے مل کر انھیں اطمینان ہوا کہ صحیح قدرے سیاسی ہے تو یہی ہے اور ملک کی آزادی مسلمانوں کی فلاح اور ملی اتحاد و ترقی کی راہ ہے تو یہی ہے۔

مولانا ملیح آبادی کی مولانا سے پہلی واقفیت سنہ ۱۹۱۲ء میں ہوئی تھی لکھتے ہیں:

۱۹۱۲ء میں الہلال نکلا، میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں پڑھتا تھا۔ پہلا پرچہ دیکھتے ہی الہلال کو دل دے بیٹھا۔ میں الہلال پڑھتا رہا۔ چھٹیوں میں لکھنؤ سے گھر آتا تو والد کو بھی سناتا تھا۔" ۵

مولانا آزاد سے بیعت

مولانا سے ان کی دوسری ملاقات فروری ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں ہوئی جہاں وہ خلافت کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"کانفرنس کے بعد مولوی منیر الزماں اسلام آبادی کے ساتھ مولانا آزاد سے ملنے ان کے گھر گیا۔ رپن لین کی ایک چھوٹی سی بوسیدہ عمارت میں رہتے تھے بڑے تپاک سے ملے اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مجھ سے انجان نہیں ہیں۔ چلتے وقت دوبارہ ملاقات کا اصرار کیا اور وقت بھی مقرر کردیا، میں پہنچ گیا۔ آج تنہائی تھی ایسا معلوم ہوا کہ گویا ہم عمر بھر کے ساتھی ہیں۔ دل کھول کے ملے۔ مولانا نے تفصیل سے اپنی اسکیم بتائی کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے کیا کرنا چاہتے ہیں اور مجھے شریک ہوجانے کی دعوت دی، میں بلا کسی پس وپیش کے فوراً راضی ہوگیا۔ حیرت انگیز طور پر ہمارے خیالات میں یکسانی تھی۔" ۶

مولانا کے سیاسی و مذہبی مسائل کے بارے میں ان کے انداز فکر اور حصول آزادی اور اتحاد و تنظیم ملت کے بارے میں ان کے خیالات اور طریق کار سے کامل اتفاق کے بعد ۲۲ راپریل ۱۹۲۰ء کو انھوں نے

مولانا کے ہاتھ پر بیعت کرلی ۔ مولانا نے انھیں لکھنؤ کو مرکز بنا کر صوبہ یوپی میں کام کرنے کی ہدایت کی اور اگلے روز مندرجہ ذیل سند خلافت عطا فرمائی ۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

اخویم مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے ۔ وہ بیعت لینے اور تعلیم و ارشادِ سلوکِ سنّت میں فقیر کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں ۔ جو طالب صادق ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے انہوں نے خود فقیر سے بیعت کی ۔ والعاقبۃ للمتقین ۔

فقیر

ابوالکلام کان اللہ لہٗ (۴ شعبان ۱۳۳۸ھ)"[1]

مدرسۂ اسلامیہ کلکتہ

مولانا کی ہدایت کے مطابق انھوں نے لکھنؤ کو مرکز بنا کے کام شروع کر دیا ۔ اس مدت میں کئی سو آدمی حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے ۔ اکتوبر یا نومبر ۱۹۲۰ء میں مولانا نے انھیں کلکتہ بلا لیا جہاں وہ مدرسہ اسلامیہ کے قیام کے لیے کوشاں تھے اور اس کے اہتمام و انتظام کے لیے انھیں ایک قابل اعتماد رفیق کی ضرورت تھی ۔

یہ مدرسہ تحریک ترک موالات کے زمانے میں سرکاری مدرسوں سے

---

[1] [illegible] مکاتیب ابوالکلام آزاد، مرتبہ ابو سلمان شاہجہانپوری ص ۱۰۳

نکلے ہوئے طلبہ کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی نے اس مدرسے کا افتتاح کیا تھا۔ تقریباً دو سال تک نہایت شان کے ساتھ چلا۔ مولانا کی وجہ سے بہت سے فاضل جمع ہو گئے تھے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ندوہ کے فاضل عبدالرحمٰن نگرامی اس کے اساتذہ میں شامل تھے۔ لیکن ۱۹۲۱ء کے اواخر میں مولانا آزاد اور ملیح آبادی اور مدرسے کے کئی ہمدردوں کی گرفتاریوں سے اس کی ترقی پر بہت برا اثر پڑا پھر جوں جوں تحریک خلافت کا زور کم اور ترک موالات کا جوش ٹھنڈا پڑتا گیا اس مدرسہ کی طرف سے بھی لوگوں کی توجہ ہٹتی گئی اور بھی متعدد رکاوٹیں تھیں رہائی کے بعد مولانا خود بھی اس کے لیے پورا وقت نہیں دے سکتے تھے اس وجہ سے اس کی اہمیت کم ہوتی گئی اور آخر کار وہ برائے نام مدرسہ رہ گیا۔

سلسلۂ بیعت وارشاد

مولانا ملیح آبادی کو لکھنؤ میں صرف پانچ چھ ماہ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس مدت میں جو کئی سو آدمی حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے ان میں مولوی شفاعت علی اور سردار محمد خاں کے نام خود ملیح آبادی کے بیان میں آئے ہیں اور کچھ مزید تفصیل کے علاوہ منے خاں کا ایک نام مولانا ریاست علی ندوی کی تحریر میں آیا ہے مولانا ریاست علی جو مولانا ملیح آبادی کے دوبارہ داخلہ ندوہ سے لے کر کلکتہ جانے تک ان کے ساتھ رہے تھے اور ملیح آبادی کی زندگی اور ان کے کام کو ایک رازداں اور غم گسار دوست اور رفیق کی حیثیت سے دیکھا تھا

فرماتے ہیں:

"مولانا ملیح آبادی نے بیعت کے سلسلے کو آگے بڑھایا کرسچین کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی کے کچھ طلبہ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے نیز مولوی گنج اور گولا گنج کے کچھ جوشیلے مسلمانوں نے بھی بیعت کی جن میں منے خاں صاحب بھی تھے۔ اسی طرح دریبہ گنج کے کچھ مسلمان جن میں بعض اطبا بھی تھے، داخل حلقہ ہوئے تھے۔ لیکن جب مولانا کے بلاوے پر وہ کلکتہ چلے گئے تو بیعت و ارشاد کا یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا۔"[۱]

ملیح آبادی کی گرفتاری

مدرسہ اسلامیہ کلکتہ کے اہتمام کی ذمہ داری کے ساتھ، مولانا کی نگرانی میں "پیغام" اخبار جاری کیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں پیغام ہی کے ایک مضمون کی بنا پر ملیح آبادی گرفتار ہوگئے اگرچہ وہ مضمون خود ان کے قلم سے نہ تھا۔

مولانا آزاد کا اعتراف

مولانا نے ان کی گرفتاری پر ایک پرزور تحریر لکھی اس سے ملیح آبادی کی سیرت و کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے نیز ان سے مولانا کے تعلق خاطر کا پتا چلتا ہے مولانا فرماتے ہیں:

"کل چار بجے جب میں بمبئی سے کلکتہ پہنچا اور متوقع تھا کہ حسب معمول اسٹیشن پر مولوی عبدالرزاق صاحب سے ملاقات ہوگی تو ان کی جگہ ان کی گرفتاری کی خبر نے میرا استقبال کیا۔ وہ اسٹیشن پر ملتے تو میرے

---

[۱] آزاد ہند کلکتہ ۱۹۶۱ء ملیح آبادی نمبر، صفحہ ۲۱

دل میں ان کی محبت بڑھتی جو گزشتہ دو سال سے برابر بڑھتی رہی ہے مگر وہ نہ ملے اور جیل خانے چلے گئے۔ اس طرح انھوں نے صرف اپنی محبت ہی نہیں بلکہ اپنی عزت کے لیے بھی میرے دل میں تقاضا کیا، اب میں ان سے صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی عزت بھی کرتا ہوں۔"

"۱۹۱۰ء میں وہ ہندوستان واپس آئے اور اس وقت سے اب تک برابر علمی وقومی خدمات میں مشغول رہے۔ نہ صرف وہ بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے جوشِ ایمان اور حبِ اسلامی کے اعتبار سے اخلاص وعمل کا ایک قابلِ عزت گھرانا ہے ان کے والد اور تینوں بھائی ہمیشہ راہِ حق وعمل میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ ان کے بڑے بھائی ملیح آباد میں اس لیے گرفتار کر لیے گئے تھے کہ انھوں نے مقاصد خلافت کی تبلیغ کے لیے ایک اعلان شائع کیا تھا۔"

"دو سال ہوئے جب وہ مجھ سے ملے اور میں نے ان میں بہترین قابلیت علم وعمل نمایاں پائی۔ یہ ملک کے ان مخصوص اہل علم نوجوانوں میں ہیں جن کی غیر معمولی قابلیتوں سے بہترین امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ انہوں نے خدمتِ خلق ودعوت کی راہ میں مجھ سے جو رشتۂ رفاقت واخوت جوڑا تھا وہ روز بروز قوی ہوتا گیا اور ایک سچے رفیق اور بھائی کی طرح ان کی صداقت میرے دل کو جذب کرتی رہی پچھلے دنوں جب مدرسہ جامع مسجد عربی کا افتتاح ہوا تو میں نے انھیں کلکتہ بلا لیا اور انہی کی محنت وسعی سے

مدرسہ قائم ہُوا۔ یہ مشغولیت ان کے لیے کم نہ تھی لیکن ان کا ولولۂ خدمت زیادہ وسیع میدان ڈھونڈتا تھا۔ بالآخر "پیغام" جاری ہُوا اور اس کی ترتیب و اشاعت کا تمام بار انھوں نے اپنے سر لے لیا۔ یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس بار کے وہ اہل تھے اور نہایت مستعدی و قابلیت سے تن تنہا اس کی ایڈیٹری کرتے رہے۔ قارئین پیغام میں کوئی شخص نہ ہوگا جو ان کی تحریروں کو دلچسپی و شوق کے ساتھ نہ پڑھتا ہوگا۔"

"اب وہ گرفتار ہو گئے، میں کہنا چاہتا ہُوں کہ خدا تعالیٰ نے ان کی حُسنِ نیت اور حُسنِ عمل کو قبول کر لیا۔ اس بارے میں انسانی قلب کی درماندگیوں کا کچھ عجیب حال ہے، میں اگر کہوں کہ میرے دل پر کوئی صدمہ نہیں، تو یقیناً میں اپنے قدرتی جذبات کے لیے پردہ پوش ہوں گا۔ میں اپنے دل کو راز بنانا پسند نہیں کرتا۔ میرے دل کو ایسے موقعوں پر غم ہُوا ہے ...... لیکن الحمدُ للہ کہ دل کے جذبے پر دماغ کا ایمانی یقین و اعتقاد غالب ہے ..... میں خوش ہوں اور سچے دل سے اپنے عزیز رفیق کو مبارکباد دیتا ہُوں، وہ بے گناہ ہیں اور ان کی گرفتاری ان کیلئے ایک پاک عبادت ہے انھوں نے جس سچی اور بے تکلف ہمت و بشاشت کے ساتھ اپنی گرفتاری کا استقبال کیا اور جس اطمینان و استقامت کے ساتھ اس وقت قید خانے میں ہیں خدا تعالیٰ وہ جوہر ہر مسلمان کو عطا کرے۔"[1]

---

[1] ذکر آزاد ص ۱۰۳، ۱۰۴

مولانا آزاد نے ملیح آبادی کو جو شاندار خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ کوئی معمولی اعزاز نہیں۔ مولانا نے اپنے معاصر علمائے دین اکابر سیاست میں اتنے شاندار الفاظ میں کسی کی سیرت و خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے اور اپنے معاصر کے معاملے کو ہمیشہ تاریخ کے حوالے کیا لیکن ملیح آبادی سے ان کی دلی محبت اور تعلق نے یہ گوارا نہ کیا کہ ان کا مقدمہ تاریخ کے فیصلے کے لیے چھوڑ دیں بلکہ ان کی بہترین سیرت، بلند کردار اور عظیم الشان خدمات کے متعلق اپنی شہادت قلم بند کر گئے" تاکہ تاریخ کی عدالت میں جب ان کا مقدمہ پیش ہو تو مورخ کو صحیح فیصلے تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔

الجامعہ کا اجراء

ملیح آبادی کی گرفتاری کے بعد مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم نے چند پرچے "پیغام" کے نکالے لیکن مولانا آزاد بھی گرفتار ہو گئے تو اس کا جاری رکھنا مشکل ہو گیا اور "پیغام" بند ہو گیا۔ ملیح آبادی کو اس مقدمہ میں دو سال قید کی سزا سنائی گئی۔ البتہ رہائی ایک سال کے بعد ہی مل گئی۔ رہائی کے بعد "الجامعہ" کے نام سے ایک پرچہ نکالا جو مولانا آزاد کی نگرانی میں اپریل ۱۹۲۳ء سے جون ۱۹۲۴ء تک جاری رہا۔

الہلال کا دوبارہ اجراء

جولائی ۱۹۲۷ء میں "الہلال" کا دور ثانی شروع ہوتا ہے۔ اس کی تمام ذمہ داری ملیح آبادی پر تھی۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں الہلال بند ہوا اس کے ساتھ ہی مولانا کی رفاقت کا آٹھ سالہ دور بھی ختم ہو گیا۔ ابھی تک وہ مولانا کے ساتھ

رہتے تھے اب انھوں نے علیحدہ رہائش کا انتظام کرکے مصر و قسطنطنیہ کے بعض اخبارات کی نامہ نگاری اور تالیف و ترجمہ کا شغل اختیار کیا پھر کلکتہ ہی سے اپنا اخبار نکالا اور خوب چلایا۔

دہلی میں قیام ملک کی آزادی کے بعد مولانا آزاد ہندوستان کے وزیر تعلیم بنے تو انھوں نے ملیح آبادی کو بھی ۱۹۴۹ء کے اواخر میں دہلی بلالیا۔ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کا عربی سہ ماہی رسالہ "ثقافت الہند" ان کی ارادت میں جاری ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے عربی شعبے کے مشیر اور پھر مدیر مقرر ہوئے۔

انتقال پر ملال ملیح آبادی کو مولانا سے بڑی محبت تھی۔ مولانا کے انتقال کے بعد ان کا دل بھی دنیا سے اچاٹ ہوگیا۔ صحت ۱۹۵۴ء سے خراب تھی۔ کینسر کی ابتدا ہو چکی تھی کئی بار مرض ابھر چکا تھا اور علاج سے عارضی افاقہ ہوگیا تھا مولانا کی وفات کے بعد مرض عود کر آیا صحت روز بروز گرتی چلی گئی۔ بالآخر ۲۴ جون ۱۹۵۹ء کو وہ بھی جوار رحمت میں چلے گئے۔

مولانا ابوالمحاسن سیّد محمد سجّاد

مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صوبہ بہار کے سربرآوردہ علماء میں سے تھے جمعیت علماء، خلافت کمیٹی اور امارت شرعیہ بہار کے قیام میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا۔ انہوں نے اپنے صوبے میں تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک سول نافرمانی کو پروان چڑھایا اور ملک کی آزادی میں حصہ لینے کے لیے صوبے میں عام بیداری پیدا کی اور علمائے دین کو سامنے سیاسی جدوجہد میں نہ صرف حصہ لینے پر مجبور کیا بلکہ انھیں صوبے میں سیاسی رہنمائی کے مقام پر لاکھڑا کیا۔

مرحوم مولانا ابوالمحاسن صوبہ بہار کے قصبہ بہار کے ایک موضع میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے قصبہ بہار میں مولانا وحید الحق استھانوی بہاری کے مدرسہ اسلامیہ میں حاصل کی۔ آخری تعلیم الہ آباد کے مشہور مدرسہ سبحانیہ میں مولانا عبدالکافی الہ آبادی علیہ الرحمہ کے درس میں ہوئی

درس و تدریس

تعلیم سے فراغت کے بعد سات سال تک مدرسہ اسلامیہ قصبہ بہار اور مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ۱۳۲۹ھ میں انھوں نے گیا میں مدرسہ انوار العلوم

لی بنیاد ڈالی اور مدت دراز تک مدرس اول کی حیثیت سے درس وتدریس اور نظم وانتظام مدرسہ کی بہترین خدمات انجام دیں۔

تحریک الہلال سے دلچسپی سیاست سے دلچسپی انھیں جنگ طرابلس اور بلقان کے زمانے سے پیدا ہوئی اسی وقت سے وہ ملک کی آزادی کے لیے سرگرم کار ہو گئے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریک الہلال سے ان کی دلچسپی اسی زمانے سے تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کی تحریک نے بنگال کے قرب کے سبب سے بہار پر پورا اثر کیا تھا اور بہت سے علمائے ان کی اس تحریک پر لبیک کہا۔ ان میں مولانا سجاد کا نام بھی لیا جا سکتا ہے"؛ [۱]

تحریک نظم جماعت سے وابستگی پھر جب مولانا آزاد نے نظم جماعت کے سلسلے میں کوشش کی تو مولانا سجاد مرحوم نے اس دعوت کے قبول کرنے میں اقدام وسبقت سے السابقون الاولون کا مقام حاصل کر لیا۔ حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"رانچی کی اسیری کے زمانے میں مولانا ابوالکلام نے ہم خیال وکار فرما علما کی تلاش وتفتیش کا کام ایک مخلص [۲] کے سپرد کیا تھا۔

---

[۱] یادرفتگاں، مکتبۃ الشرق، کراچی ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۴۲

[۲] ان مخلص کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

انھوں نے جن علما کا نشان دیا، ان میں ایک مولانا سجاد بھی تھے جو اس وقت انوار العلوم گیا کی مسند درس پر تھے"۔[۵۱]

امارت شرعیہ بہار کا قیام

مولانا ابوالکلام آزاد نے انھیں اپنے محبین و مخلصین میں شمار کیا ہے۔ وہ صوبہ بہار میں تحریک نظم جماعت کے اہم کارکنوں اور ان خوش نصیبوں میں سے تھے جن کی مساعی سے کم از کم ایک صوبے میں نظم جماعت اور امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آگیا۔ ان کی اس عظیم الشان خدمت کے اعتراف میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

" بہار میں امارت شرعیہ کا قیام ان کی سب سے بڑی کرامت ہے۔ زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقے میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں "معارف" میں اس تحریک کو اٹھایا گیا اور اصلاحات کے سلسلے میں اس کو پیش کیا گیا۔ پھر سنہ ۱۹۲۰ء میں یورپ سے واپسی کے بعد چاہا کہ اس کو تمام ہندوستان کا مسئلہ بنایا جائے مگر اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ علم برداروں نے اس کو کسی طرح چلنے نہ دیا مگر بہار میں مولانا سجاد صاحب کی قوت عمل نے اس کو وجود کا قالب بخش دیا"۔[۵۲]

---

۵۱ یاد رفتگان صفحہ ۲۴۲

۵۲ یاد رفتگان صفحہ ۲۴۳ - ۲۴۲

عوام کا محبوب

قومی و ملی کاموں میں انھوں نے زندگی بھر نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو بلا امتیاز مذہب و ملت اہل ملک کی خدمت کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں۔ عوام کی بے لوث خدمت کے اسی جذبے نے انھیں صوبہ بہار کے تمام طبقوں کی ایک مشترک میراث اور محبوب ترین شخصیت بنا دیا تھا۔ علمائے کرام کے طبقے میں انھیں جس عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جمعیت علمائے صوبہ بہار کے قیام کے بعد شاید ہی کوئی ایسا سال آیا ہو جس میں وہ جمعیت کے ناظم نہ رہے ہوں اور بہار میں نظم جماعت اور امارت شرعیہ کے قیام کے بعد وہ مدت العمر نائب امیر شریعت کے عہدے پر فائز رہے۔

بہار کی تنہا دولت

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ان کے انتقال پر "معارف" اعظم گڈھ میں ایک پرسوز مقالہ لکھا تھا جس میں انھوں نے ان کے فضائل و محاسن شخصی و علمی اور ان کی خدمات دینی و ملی کا نہایت شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا تھا۔ اس میں مرحوم نے آں موصوف کو ملک کے لیے پیام رحمت، بہار کی تنہا دولت اور تنظیمی و تبلیغی اور مذہبی و سیاسی تمام تحریکات کی چہل پہل کا باعث قرار دیا تھا۔ سید صاحب مرحوم کے یہ الفاظ ان کے سوز دلی کے آئینہ دار ہیں:

> "وہی ایک چراغ تھا جس سے یہ سارا گھر روشن تھا۔ وہ وطن کی جان اور بہار کی روح تھے، وہ کیا مرے کہ بہار مر گیا!
> مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا" ؎

مسلم لیگ اور تحریک شیخ الاسلامی

مولانا سجاد مرحوم نے جب مولانا آزاد کے ماذون و ماً مور کی حیثیت سے نظم جماعت کا کام شروع کیا تو علما کے حلقے میں کام کا نتیجہ توصوبہ بہار میں نظم جماعت اور عمارت شرعیہ کے قیام کی صورت میں نکلا اور دنیا نے ان کے مساعی کے ثمرات دیکھ لیے لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ انھوں نے ۱۹۱۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی کے موقع پر اس کے پلیٹ فارم سے مولانا عبدالباری رح فرنگی محلی کے ذریعے مسئلہ شیخ الاسلامی کی نسبت مندرجہ ذیل دو تجاویز پیش کرانے اور انھیں منظور کرانے کی کوشش کی تھی۔

"۱- آل انڈیا مسلم لیگ تمام اسلامی احکام و اعمال کے انصرام کیلیے تقرر شیخ الاسلام فی الہند کو نہایت ضروری خیال کرتی ہے اور اس امر پر یقین کامل رکھتی ہے کہ بغیر مشیخت اسلامیہ (سیاسی و ملی) حقوق اور مذہبی احکام کی حفاظت غیر ممکن ہے۔

۲- آل انڈیا مسلم لیگ گورنمنٹ سے پر زور لفظوں میں یہ درخواست کرتی ہے کہ مسلمانوں کی وفاداری و اطاعت شعاری پر کامل اعتماد رکھتے ہوئے مسلمانان ہند کے مذہبی احکام کی حفاظت کے لیے با اختیار مشیخت اسلامیہ فی الہند عطا فرمائے"۔ [۱]

اگرچہ مولانا سجاد مرحوم اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے۔

---

[۱] نقوش، لاہور، خطوط نمبر (جلد ۲) صفحہ ۹۳۔

مسلم لیگ اپنے پلیٹ فارم سے اس تجویز کو منظور کر کے اپنی قیادت کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی تھی لیکن مرحوم کی پر اخلاص مساعی اور قیام شریعت اسلامیہ کے لیے ان کی بے چینیوں کا ایک انمٹ نقش تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو گیا جو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔

بے نفسی کا نمونہ

مولانا سجاد مرحوم اخلاص و بے نفسی کا مجسمہ تھے ان کی کسر نفسی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۲ء میں جمعیت العلمائے بنگال کی سالانہ کانفرنس کی صدارت کے لیے کارپردازان جمعیت اور منتظمین جلسہ کے بے حد اصرار پر چاٹگام تشریف لے گئے لیکن جمعیت کے ایک کارکن نے غلطی سے مولانا فاخر الہ آبادی کو بھی جلسہ کی صدارت کی دعوت دیدی تھی اس لیے وہ بھی پہنچ گئے ہر چند کہ منتظمین جلسہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے لیکن مولانا سجاد مرحوم اپنے حق سے دست بردار ہو گئے اور مولانا فاخر کو جلسہ کا صدر بنا دیا۔[۵]

حقیقت پسند عالم دین

ہندوستان کے سیاست داں علماء میں مولانا سجاد بہاری بڑے ہی کامیاب اور حقیقت پسند عالم تھے۔ سیاسی سوجھ بوجھ میں بے مثال تھے اور تنظیمی اور عملی صلاحیتوں میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، سول نافرمانی اور بہت سی قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

---

[۵] نقوش، لاہور، خطوط نمبر (جلد ۲) خط مولوی منیر الزماں اسلام آبادی بنام مولانا عبد الباری فرنگی محلی، ۱۹۲۲ء۔

مگر کبھی گرفتار نہیں ہوئے۔ صوبہ بہار میں مسلم مفاد کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے۔ دینی مسلک کے لحاظ سے علمائے دیوبند کے پیرو اور سیاست میں جمعیۃ علمائے ہند کے مسلک کے پابند تھے۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۴۶ء کو پھلواری شریف میں اس عالم باعمل اور مجاہد فی سبیل اللہ نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔

باب ہفتم

مُریدینِ مخلصین

خواجہ عبد الحی فاروقی

پیدائش اور تعلیم خواجہ عبد الحی فاروقی مرحوم برصغیر پاک و ہند کے مشہور عالم دین تھے۔ ۱۸۹۶ء میں ضلع گورداسپور کی تحصیل شکر گڈھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی ابتدا مقامی مدرسے سے ہوئی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول گورداسپور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اس کے بعد لاہور آ گئے اور اسلامیہ کالج میں پڑھا۔ اس کے بعد علوم دینی کی طرف متوجہ ہوئے اور دار العلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رح کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری ان کے دار العلوم کے ساتھیوں میں سے تھے۔ جس زمانے میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم دیوبند میں تھے اور جمعیت الانصار کی تنظیم اور قدیم طلبائے دار العلوم کی سیاسی تنظیم و تربیت میں مصروف تھے۔ خواجہ صاحب مرحوم نے بھی ان سے تفسیر پڑھی تھی۔ کچھ مدت دہلی میں قیام رہا تھا اور طب کی تکمیل بھی کر لی تھی۔

سیاست سے دلچسپی حضرت شیخ الہند کے فیض تعلیم و تربیت اور امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی

صحبت کا نتیجہ تھا کہ وہ شروع ہی سے سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے ملک کی آزادی کی تحریک میں عملاً شریک رہے۔ ریشمی رومال کی تحریک کے سلسلے میں ہندوستان میں جن حضرات کو اس سے تعلق یا تعلق کے شبہ میں پکڑا اور زندان میں ڈالا گیا ان میں خواجہ صاحب مرحوم بھی تھے اس موقع پر انھیں سینٹرل جیل ملتان میں قید کیا گیا تھا اس سے پہلے وسط سنہ ۱۹۱۶ء میں بھی وہ گرفتار و نظر بند کیے جا چکے تھے۔ حریت طلبی اور حق گوئی کے جرم ہی میں وہ اس کے بعد بھی متعدد بار قید و نظر بند کیے گئے لیکن مرحوم ان تمام آزمائشوں سے سرخ رو گزرے۔ سیاست سے ان کو دلچسپی زندگی بھر رہی اس کے باوجود ان کا اصل مقام عملی سیاست کے بجائے علم و فضل اور درس و تدریس تھا اور ان کی زندگی کے بیشتر شب و روز علمی و تدریسی مشاغل میں بسر ہوئے۔

پاکستان آنے کی تحریک

خواجہ عبدالحئی مرحوم ایک مدت تک جامعہ ملیہ دہلی میں دینیات کے پروفیسر رہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد تقریباً دو سال تک حضرت بل (کشمیر) میں شیخ محمد عبداللہ کے قائم کردہ دارالعلوم میں بھی درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کے خاندان کے لوگ اور اعزہ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آگئے تھے۔ حضرت خواجہ صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گذرا تھا اور وہ برصغیر پاک و ہند کے انقلاب پسند دینی مکتبہ فکر اور علمائے حق سے وابستہ رہے تھے اس لیے انھیں تردد تھا کہ پاکستان میں وہ آزادی اور دلجمعی کے ساتھ کام کر سکیں گے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے انھیں مشورہ دیا کہ انھیں پاکستان جانا چاہیے

مولانا آزاد کے نزدیک پاکستان میں دینی کام کرنے، صحیح سیاسی جمہوری شعور پیدا کرنے اور پاکستان کو مضبوط و مستحکم بنانے کی ضرورت ہندوستان کے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بھی بہت اہم تھی۔ اس لیے مولانا آزاد نے جہاں متعدد دیگر قابل اور ماہرین کو پاکستان جانے کا مشورہ دیا تھا، خواجہ صاحب مرحوم کو بھی انھوں نے پاکستان جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس معاملے میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا مشورہ بھی یہی تھا۔ خاندان کے حالات بھی اسی کے متقاضی تھے چنانچہ ۱۹۵۱ء میں خواجہ صاحب پاکستان تشریف لے آئے۔

ان کے پاکستان آنے میں خود پاکستان کے بعض اکابر کے ایما و اصرار کو بھی دخل تھا اور توقع تھی کہ تعلیمات کے شعبے میں ان کے علم و فضل اور تجربے سے فائدہ اٹھایا جائے گا لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! تقریباً دو سال تک انتظار رہا کہ حسب وعدہ و توقع ان سے تعلیمات کے شعبے میں ان کے شایان شان کام لیا جائے گا۔ جب اس طرف سے مایوسی ہوئی تو اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں اسلامیات اور عربی کے شعبے کی صدارت قبول کر لی اور بقیہ عمر طلبہ کی تعلیم و تربیت میں بسر کر دی۔

تصنیف و تالیف

تعلیم و تدریس کے ساتھ انھیں تصنیف و تالیف کا ذوق بھی تھا۔ اسی ذوق کا نتیجہ تھا کہ شعبۂ اسلامیات و عربی کے زیر اہتمام "بزم علوم اسلامیہ" قائم کی تھی اور قرآن حکیم کی تفسیر کی تالیف اور اس کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے۔ قرآن حکیم سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ ان کے متعدد رسائل قرآن

حکیم کی تفسیر کے سلسلے میں ان کے ذوق کی یادگار ہیں۔

مولانا آزاد سے تعلق

خواجہ صاحب مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد کے قدیم وخاص ارادت مندوں میں سے تھے۔ انھوں نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی۔ حزب اللہ میں شامل تھے۔ مولانا نے کلکتہ میں دارالارشاد قائم کیا تو خواجہ صاحب نے اس میں مولانا کے درس قرآن حکیم سے استفادہ کیا۔ ۱۹۱۶ء میں مولانا آزاد کو کلکتہ سے اخراج کا حکم ملا، اس وقت پندرہ بیس طالب صادق جمع ہو چکے تھے۔ لیکن کلکتہ سے مولانا کے اخراج کی وجہ سے یہ سلسلۂ درس و تعلیم ٹوٹ گیا۔ جو حضرات جمع ہوئے تھے منتشر ہو گئے۔ خواجہ صاحب لاہور تشریف لے آئے۔ مولانا سے تعلق وارادت اور ان کی رفاقت کی قیمت انھیں یہ دینی پڑی کہ لاہور میں نظر بند کر دیے گئے۔

انتقال اور علمی یادگار

خواجہ صاحب نے متعدد بلند پایہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں ان میں سورہ بقرہ، سورہ آل عمران، سورہ انعام، سورہ توبہ، سورہ یوسف، تیسویں پارے کی چند سورتوں کی تفسیر بھی ہیں جو اصلاً مولانا آزاد کے افادات پر مبنی ہیں۔

خواجہ صاحب نہایت نیک، متقی، وسیع النظر، صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ ۸ر جنوری، ۱۹۶۵ء کو لاہور میں انتقال فرمایا اور مالک حقیقی سے جا ملے۔

مولانا سید داؤد غزنوی

پنجاب کا تنہا شرف

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں پنجاب کے مخصوص سیاسی مزاج، برٹش حکومت سے کمال وفاداری، اس کے استحکام و دفاع، مخصوص خدمات، برطانوی مفاد کے تحفظ کے لیے جان سپاری اور قربانی اور سب سے بڑھ کر دین کے نام پر برٹش استعمار کی وفادار و خیر خواہ ایک سیاسی تحریک کے آغاز و فروغ کی بنا پر سب سے زیادہ رسوائی اور بدنامی اسی کے حصے میں آئی ہے۔ لیکن پنجاب کا ایک ایسا شرف بھی ہے جس میں برصغیر پاک و ہند کا کوئی صوبہ اس کا شریک نہیں، وہ اس پر جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔ پنجاب کا یہ فخر علمائے حق کی اس مقدس جماعت کی وجہ سے ہے جس نے کفر زار ہند میں اپنے قیام و سکونت اور مراکز علمی و دینی کے لیے پنجاب کا انتخاب کیا۔ علما کی اس مقدس جماعت کی اشاعت و تبلیغ اسلام کی جولانگاہ اگرچہ مشرق و مغرب کے تمام دیار و امصار رہے لیکن وہ اپنے مراکز سے دور و بے تعلق کبھی نہ ہوئے ان کا محور علمی و دینی ہمیشہ پنجاب رہا۔ اسلامی ہند کے آخری ڈھائی سو سال میں ان کی خدمات دینی کی تاریخ نہایت شاندار رہی ہے۔

علمائے حق کی یہ مقدس جماعت مزرعۂ ہند پر ابر کرم کا ایک چھینٹا تھا جس نے مسلمانوں کے نخلِ امید کو سرسبز و شاداب کر دیا۔

غزنوی خاندان

تاریخ کے ہر دور میں اور علم و عمل کے ہر میدان میں بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے جن کی عظمتوں کا دنیا نے اعتراف کیا ہے اور جن کے آگے دنیا نے عقیدت و احترام کا سر جھکایا ہے۔ لیکن اگر کسی ایک ایسے خاندان کی تلاش کی جائے جو گزشتہ کئی صدیوں سے تا این دم اور جس کے اسلاف سے لے کر اخلاف تک بلا انقطاع توارث و تسلسل علم و عمل کی مختلف مملکتوں کے تاجدار رہے ہوں اور اصحاب علم اور طالبان صدق و صفا کی مقدس آبادیوں نے جن کے مطیع و فرمانبردار اور باجگذار ہونے پر فخر کیا ہو اور جس کے نہ صرف اسلاف میں بلکہ اخلاف میں بھی بیک وقت کئی کئی اصحاب درس و افتا، سجادہ نشین سلوک و تصوف اور ارباب سیاست و تدبر رہے ہوں اور اس سے بڑھ کر جس خاندان کا ایک ایک فرد مذہب و سیاست اور مختلف علوم و فنون کے اصول و فروع پر یکساں حاوی اور اپنے وقت میں علم و عمل کا شہنشاہ رہا ہو تو ہمیں صرف ایک خاندان نظر آتا ہے جس کے اخلاف صالح اپنے اسلاف کرام کی سنت علمی و عملی کے عامل اور اس کے محافظ ہیں اور وہ خاندان ہے مولانا سید محمد داؤد غزنوی کا۔

تعلیم و تربیت

مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا سید عبداللہ غزنوی کے عظیم پوتے، مولانا سید عبدالواحد غزنوی اور مولانا سید عبدالاول غزنوی کے سعید بھتیجے اور

مولانا سید محمد اسماعیل غزنوی کے برادر عزیز تھے۔ ان میں سے ہر شخص علم دنقوی تعلیم، کتاب وحکمت، تمسک بالحدیث، تعمیل واتباع سنت اور عشق سیرت رسالت پناہی میں ممتاز اور علم وعمل کے لحاظ سے عوام وخواص میں سربلند وارجمند تھا۔ ان کے جد امجد غزنی سے ہجرت کرکے امرتسر میں آبسے تھے۔ یہیں گزشتہ صدی کی آخری دھائی میں مولانا داؤد غزنوی کی ولادت ہوئی۔ [1] ابتدائی علوم وفنون اسلامی کی تعلیم اپنے خاندانی بزرگوں سے پائی۔ اسلامی علوم سے ذہنی مناسبت ہی نہ تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کی شخصیت کا خمیر ہی دینی علوم وفنون کی مٹی سے تیار ہوا تھا۔ اس لیے اصول وفروع پر کم عمری ہی میں ان کا عبور باعث حیرت نہ تھا، پھر بھی رسمی اور روایتی طور پر تکمیل کے لیے دہلی ولکھنؤ کا سفر کیا۔ دہلی میں شیخ الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی اور مولانا سید عبداللہ غازی پوری کے درس حدیث سے فیض یاب ہوئے، پھر فقہ، منطق، فلسفہ وغیرہ کی تکمیل کی طرف توجہ فرمائی۔ علوم عقلی میں انھوں نے مولانا سیف الرحمٰن کابلی، مدرسہ فتح پوری کے مشہور مدرس سے خاص طور پر اور لکھنؤ میں بعض شیعہ علماء ومجتہدین سے استفادہ کیا۔

ابتدائی عملی زندگی

تکمیل کے بعد وطن مالوف امرتسر واپس تشریف لائے اور کئی سال تک نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ اپنے آبائی مدرسہ غزنویہ میں تعلیم وتدریس میں مصروف رہے اور اپنے خاندان کی روایت کے مطابق تشنہ کامان علوم دینی کو سرچشمہ کتاب و

---

[1] جولائی کا آخری یا اگست کا پہلا ہفتہ سنہ ۱۸۹۵ء

سنت سے سیراب کرتے رہے۔

اِس زمانے میں انھوں نے اپنے ذوقِ تعلیم کتاب و سنت اور کمالِ تدریس علوم و فنون ہی کی بنا پر شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں کی تھی بلکہ اپنے جوش و اصلاح ملت ولولہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام جذبہ خدمت خلق، تحریک آزادی وطن سے اپنی دل چسپی اور کمال خطابت کی وجہ سے بھی امرتسر میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔ وہ اپنی نوجوانی میں بھی میر کاروان کی صفات بلند نگاہی دل نوازی سخن اور پُر سوزی جان سے بہرہ مند تھے۔

میدان سیاست میں

سنہ ۱۹۱۹ء تک وہ میدان سیاست میں بھی نظر آنے لگے تھے۔ جلیا نوالہ باغ کے حادثے کے بعد تو وہ ایک سیاست داں کی حیثیت سے عوام کی رہنمائی کے مقام پر پہنچ گئے۔ جلیا نوالہ باغ کے حادثے اور پنجاب میں مارشل لا کے نفاذ سے پنجاب میں اور خصوصاً امرتسر میں عوام کے دلوں پر جو ہیبت طاری ہو گئی تھی مولانا داؤد غزنوی نے اسے دور کرنے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ انھوں نے اس وقت آزادی کی تحریک کی حمایت کی جب پنجاب میں کانگریس کے بڑے بڑے نیتا اپنے گھروں کے گوشے ہائے عافیت میں چھپے بیٹھے تھے اور بیرون پنجاب کے سیاسی رہنما پنجاب کا رخ بھی نہ کرتے تھے۔

انھوں نے اپنی عمر کے بارہ برس حریت طلبی، برٹش استعمار کی مخالفت اور حق کوشی کے جرم میں قید و بند کی نذر کر دیے! انھوں نے استخلاص وطن کی جدوجہد میں کانگریس جمیعت علماء ہند، مجلس احرار اسلام اور تحریک حریت

نواز اور آزادی خواہ تحریک کا ساتھ دیا اور جب حریت طلبی کی جنگ کے بجائے ملک کی تعمیر و ترقی کا میدان عمل ان کے سامنے کھلا تو وہ بے جھجھک اور بلا خوف لومۃ لائم مسلم لیگ میں شریک ہو گئے کہ اس وقت پنجاب، سرحد وغیرہ کے مسلم رہنماؤں کے لیے یہی ملی بہی خواہی کا تقاضا تھا۔ شاید یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گی کہ پنجاب، سرحد کے جن سیاسی رہنماؤں کو مولانا ابوالکلام آزاد نے لیگ میں شامل ہو جانے کا مشورہ دیا تھا۔ ان میں مولانا داؤد غزنوی بھی تھے۔

مولانا غزنوی مرحوم خلافت کمیٹی کے ابتدائی ارکان اور اس کی تشکیل کرنے اور مجلس احرار اسلام کو قائم کرنے والوں میں سے تھے۔ کانگریس ہائی کمان کے وہ ۱۹۴۶ء تک ممبر رہے۔ عرصے تک پنجاب کانگریس کمیٹی کے صدر رہے اور بلا تفریق مذہب و ملت ہندو، سکھ، مسلمان کی خدمت میں مصروف رہے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے۔ وہ پورے پنجاب میں واحد شخص تھے جو لیگی امیدوار کے مقابلے میں کانگریس کے ٹکٹ پر جیتے تھے۔ یہ بات عوام و خواص میں ان کے اثر و رسوخ اور ہر دلعزیزی کا بین ثبوت ہے۔ کانگریس میں شمولیت اور لیگ کے انداز سیاست سے اختلاف کے باوجود وہ لیگی حلقوں میں بھی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان کے تدبر کا ہر حلقۂ فکر میں اعتراف موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ ۱۹۴۶ء میں لیگ میں شامل ہوئے تو صوبے کی صدارت انھیں سونپ دی گئی۔

مولانا داؤد غزنوی نے ترک موالات، سول نافرمانی، خلافت، نمک سازی، ہندوستان چھوڑدو، آزادی کشمیر کی تحریکوں میں ملک و قوم کی رہنمائی کی۔ حجاز کے مسائل و معاملات کے حل میں امیر عبدالعزیز ابن سعود نے ان کی بصیرت و تدبر سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ امیر مرحوم ان سے بہت متاثر تھے۔ مسجد شہید گنج کی تحریک میں اگر ان کے تدبر سے فائدہ اٹھایا جاتا تو وہ افسوسناک صورت حال کبھی نہ پیدا ہوتی، جو تحریک کے عاقبت نا اندیش رہنماؤں کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

وہ مختلف اوقات میں جمعیت علمائے ہند کے نائب صدر اور سکریٹری کے معزز عہدوں پر فائز رہے اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر تو وہ ہمیشہ رہے جمعیت علمائے صوبہ پنجاب کا قیام آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں جمعیت علمائے ہند کا جو عظیم الشان سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تھا جمعیت کی ساٹھ سالہ تاریخ میں اس شان کا دوسرا اجلاس شاید کبھی نہیں ہوا۔ اس کی کامیابی آپ ہی کی مساعی شب و روز کی رہین منت تھی۔ اس اجلاس میں عین وقت پر صدر استقبالیہ کے صدارت سے انکار پر خطبہ استقبالیہ بھی آپ ہی کو پیش کرنا پڑا تھا۔

ذوق علمی کے ساتھ تنظیمی صلاحیتیں شاذ ہی دیکھنے میں آئی ہیں لیکن ان کی علمی و عملی تربیت ہی اس طرح ہوئی تھی کہ ان کی شخصیت میں شروع ہی سے دونوں خوبیاں جمع ہو گئیں تھیں۔ ۱۹۲۱ء میں ان کی عمر ۲۶ برس سے زیادہ نہ تھی کہ اپنے سیاسی اور علمی ذوق کی بنا پر وہ پنجاب کے پختہ کار داعیوں میں شمار ہوتے تھے۔

عبدالرشید اظہر صاحب نے ایک روایت نقل کی ہے کہ سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں جب کچھ مدت کے لیے امرتسر کی انتظامیہ شہر کا نظم و نسق قائم رکھنے میں ناکام ہوگئی اور کانگریس کمیٹی نے شہر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو شہر کے ایک حلقے کا ناظم مولانا داؤد غزنوی کو مقرر کیا گیا۔ آپ نے نہایت خوش اسلوبی اور قابلیت کے ساتھ اپنے حلقے کا انتظام کیا۔ واضح رہے کہ یہ نظامت محض رسمی نہ تھی بلکہ اس کی علمی حیثیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے بعض جرائم کی پاداش میں ہندو تاجروں پر ہزاروں روپے کے جرمانے کیے اور انھوں نے بے چون و چرا ادا کیے۔

ایک عالم و مدرس

مولانا داؤد غزنوی اپنے وقت کے بہت بڑے صاحب درس تھے۔ حدیث میں موطا امام مالک اور حکمت و فلسفۂ احکام اسلامی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی "حجۃ اللہ البالغہ" سے انھیں خاص شغف تھا اور نہایت شوق و انہماک سے وہ ان کتب عالیہ کا درس دیتے تھے۔ آداب درس کے اہتمام کے لحاظ سے وہ اپنے وقت کے امام مالک تھے۔

وہ ایک شعلہ نوا خطیب اور بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ انھوں نے دینی و سیاسی موضوعات اور مباحث پر متعدد بلند پایہ رسائل اپنی علمی یادگار چھوڑے ہیں جن میں مسئلہ توحید، نماز مسنون، اسلامی دستور، محدثین کی علمی و دینی خدمات، اسلام اور انہدام قبور، شہادت حسین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

امرتسر سے توحید کے نام سے ایک ہفت روزہ بھی جاری کیا تھا،

جسے ایک مدت تک نہایت کامیابی اور شان کے ساتھ نکالتے رہے۔ اس میں علمی و دینی اور وقت کے سیاسی مسائل میں ان کے پچاسوں مضامین نکلے۔ آپ کے ان رسائل و مضامین سے آپ کے علم وفضل اور حسن تصنیف و تالیف اور کمال انشا کی علمی و دینی حلقوں میں شہرت ہوگئی۔ برصغیر پاک و ہند کے اردو خواں اور عام پڑھے لکھے طبقے کو علم نہیں ہوگا کہ وہ کس پائے کی علمی و دینی شخصیت تھے۔ ان کے فضل وکمال، کتاب وسنت میں ان کی ژرف نگاہی اور تبحر علمی، تعلیمی اور سیاسی مسائل میں ان کی اصابت رائے کا اعتراف مصر، الجزائر، عراق، اور عرب و حجاز کے اہل علم نے کیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن اور مدینہ یونیورسٹی کی مجلس شوریٰ کا رکن منتخب ہونا ان کی فضیلت علمی کا اعتراف ہی ہے۔

دین وملت کا خادم

امرتسر میں اپنے آبائی دارالعلوم تقویۃ الاسلام (مدرسہ غزنویہ) کو نہایت ترقی دی اور نصاب تعلیم کی اصلاح، درجات کی تنظیم اور مدرسہ کی سہ منزلہ عظیم الشان عمارت کی تعمیر سے اسے ایک جامعہ کے درجے تک پہنچا دیا۔ عربی، فارسی، اردو وغیرہ کی نادر و نایاب کتابوں پر مشتمل لائبریری قائم کی مسجد کی تعمیر کی سنہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں علم وعرفان کی یہ پوری دنیا اجڑ گئی لیکن ان کے عزم اسلامی نے پھر بھی شکست نہ کھائی قیام پاکستان کے بعد ان کے کاروبار عشق کا میدان تبدیل ہوگیا اہتمام کا وہی عالم تھا۔ لاہور میں دوبارہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام کا قیام [redacted]، تعلیم وتدریس کا مشغلہ، نیز جامعہ سلفیہ

کے قیام میں اشتراک و تعاون، ساتھ ہی ملک و قوم کی تعمیر و ترقی، اصلاح امت تبلیغ و اشاعت دینی میں شب و روز کی مساعی نیز اہل حدیث کی تنظیم جماعت کی تشکیل، تعلیمی و تبلیغی رسائل کا اجراء، اہل حدیث مساجد کی تعمیر، مدارس کا قیام ان کے سوانح حیات، اور ہماری قومی علمی و سیاسی تاریخ کے روشن ابواب ہیں۔

فراست مومن کی زندہ تصویر

مولانا داؤد غزنوی کو اللہ تعالیٰ نے علم، اخلاق، سیرت کی بے شمار دولتوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ وہ مسلمانوں کی دینی و سیاسی رہنمائی کے منصب پر فائز تھے لیکن ان کا ایک بہت بڑا شرف یہ تھا کہ وہ فراست مومن کی عنایت الہی سے بہرہ مند تھے۔ کسی مسلمان کے متعلق سوئے ظن سے دور لیکن ایسے صائب الرائے اور روشن ضمیر کہ لوگوں کی لوح قلب پڑھ لیں اور الفاظ کے خوب صورت پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے نفسانی خیالات اور جذبات کے آئینے میں جھانک لیں۔ وہ مسلمان کی اس بصیرت اور فراست کی زندہ تصویر تھے جو شرعی وضعوں، متشرع شکلوں اور حسین دعووں سے کبھی دھوکا نہیں کھاتی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک واقعہ خود مرحوم کی زبانی نقل کیا ہے۔

> "ایک موقع پر علماء کے ایک مشترکہ بیان پر مولانا مودودی نے ان سے بھی دستخط کرانے چاہے جس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کیا جائے۔ مولانا داؤد غزنوی مرحوم نے فرمایا کہ اس پر میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے قتل کے حکم نامے پر میں خود

دستخط کر دوں۔"

جمعیت اہل حدیث میں بزرگ بھی ہیں اور خرد بھی' جوش و جذبات اسلامی اور اصحاب اخلاص و ایثار کی بھی کمی نہیں لیکن مولانا داؤد غزنوی علم و بصیرت کی جس سطح کے بزرگ اور جیسی صاحب نظر و فراست شخصیت تھے ان کی جگہ لینے والا اور اہل اغراض کی سیاست کو سمجھنے والا ان کے بعد نظر نہیں آتا۔

اتحاد کا داعی

وہ مسلمانوں کی مختلف خیال جماعتوں میں اتحاد کے بہت بڑے داعی تھے لیکن وہ اس اتحاد میں اس کے لیے تیار نہ تھے کہ اپنی جماعت کے اعلیٰ مصالح اور بلند مقاصد کو نظر انداز کر دیں۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ دوسری دینی یا سیاسی جماعتیں اپنی انفرادیت ختم کر کے اور ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک بین الملکی تنظیم کی شکل میں سامنے آئیں۔ یہ خواہش اپنی جگہ پر کتنی ہی خوش کن کیوں نہ نظر آئے لیکن معلوم ہے کہ عملی دنیا میں اس کی حیثیت پر کاہ کی بھی نہیں۔ ان کے نزدیک محض جذبات اور صرف خواہشات کی کوئی حیثیت نہ تھی وہ جانتے تھے کہ ہر تصور عملی سانچوں میں نہیں ڈھل سکتا۔ وہ ہواؤں میں محل تعمیر کرنے کے قائل نہ تھے۔

مولانا آزاد کی رفاقت

مولانا آزاد سے انھیں الہلال کے ابتدائی دور سے عقیدت تھی' وہ الہلال کی تحریک سے متاثر تھے۔ ان کے سیاسی اور اسلامی مزاج کے بنانے میں الہلال کا

بڑا حصہ تھا۔ قیام دہلی و لکھنؤ کے زمانے میں مولانا آزاد سے ان کا تعارف ہو چکا تھا اور ذاتی تعلقات کی بنیاد استوار ہو چکی تھی۔ دہلی میں مولانا سیف الرحمٰن، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تحریک کے خاص رکن تھے اور مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم اور مولانا آزاد سے تعلقات رکھتے تھے، ان کے فیضان صحبت سے مولانا غزنوی سیاسیات ہند کے نہ صرف اندازہ شناس ہو گئے تھے بلکہ حریت طلبی اور مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کی واپسی کے لیے سعی و عمل کی وہی شمع ان کے دل میں بھی فروزاں ہو گئی تھی جس سے ان اکابر کے سینے روشن تھے اور دل کی انگیٹھیاں دہک رہی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے اس وقت جو تعلقات قائم ہوئے تھے وہ زندگی کے آخری لمحوں تک قائم رہے۔ مولانا آزاد ان کی فکر و رائے پر اعتماد کرتے تھے اور وہ مولانا آزاد کے لیے خلافت کمیٹی، کانگریس جمعیت وغیرہ میں دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ مسئلہ خلافت ترکی اور مسئلہ حجاز میں مولانا آزاد اور مولانا غزنوی دونوں متحد الفکر اور ہم خیال تھے۔ مولانا محمد علی جوہر چوں کہ بعض معاملات میں علمائے فرنگی محل کے ہم مسلک تھے اس لیے مولانا داؤد غزنوی کی سلفی المشربی اور مولانا آزاد کی ہم نوائی اور ہم خیالی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انھوں نے قصور، امرتسر، لاہور وغیرہ کے ان علمائے حق کا نام "پنجابی ٹولہ" رکھا تھا۔

بیعت نظم جماعت

مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی روایت کو ان کے تمام تذکرہ نگاروں نے بیان کیا ہے محترم خالد اشرف صاحب لکھتے ہیں:

"۱۹۲۱ء میں جمعیت علمائے ہند کا اجلاس لاہور میں مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں ہوا۔ عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا کی کوٹھی پر جہاں مولانا کا قیام تھا' مولانا آزاد نے صبح کی نماز پڑھائی اس کے بعد لوگوں نے استخلاص وطن اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے مولانا آزاد کی بیعت کی۔ بیعت کرنے والوں میں مولانا غزنوی سب سے پہلے تھے اور حضرت سید غزنوی نے اس اجلاس بیعت کے انعقاد میں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔"

سفر آخرت

وقت کا محدث' امام علمائے حق' محقق عالم دین' مفسر قرآن' اہل حدیث کا گل سرسبد' صاحب عزیمت دعوت' الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کی عملی تشکیل' پاک باطن' نیک طینت' خلیق ومتواضع' ایثار پیشہ و بے غرض' فرشتہ خصلت و نیک نفس' عالم باعمل' زاہد شب زندہ دار ۱۶ ردسمبر ۱۹۶۳ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ان کے انتقال سے ہمارے درمیان سے ایک ایسی شخصیت اٹھ گئی جس میں تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کو ایک رشتے میں پرونے اور منتشر و متشتت افراد کو ایک جماعت بنانے کی صلاحیت سب سے زیادہ تھی۔ ان کے بعد ہمارے لیے سب سے بڑا اماتم یہ ہے کہ اب ان جیسا ہماری جماعت

میں کوئی نہیں [1]۔

---

[1] اس مضمون کی تالیف میں خالد اشرف کے مضمون مطبوعہ المنبر، لائل پور (۲، ۱۶، و ۲۳ ر ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ (تین اقساط) محمد اسلم سیف فیروز پوری کے مضمون مطبوعہ المنبر، لائل پور، ۶ و ۱۳ ر ذی الحجہ، ۱۳۸۴ھ و ۱۲ ر محرم، ۱۳۸۵ھ (دو اقساط) ڈاکٹر اسرار احمد کے مضمون مطبوعہ میثاق، لاہور (اپریل، ۱۹۶۶ء) محمد سلیمان اظہر کے مضمون مشمولہ رسالہ "اہل حدیث کی نمایاں شخصیات" اور عبد الرشید اظہر کی تالیف "سید محمد داؤد غزنوی" سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل سلفیؒ

مولانا محمد اسمٰعیل علیہ الرحمہ اپنے وقت کے بہت بڑے محدث اور عالم دین تھے، ان کی شہرت پاک و ہند سے گزر کر پورے عالم اسلام تک پہنچ چکی تھی۔ ان کا تبحر علمی اور فضائل و کمالات اسلامی علوم وفنون اور نظر و مطالعہ کے کسی ایک دائرے میں محدود نہ تھے لیکن کتاب و سنت کی تعلیم و تدریس سے ان کا شغف غیر معمولی تھا۔ اسلاف کے مقابلے میں ان کا شمار اگرچہ اخلاف میں ہوا۔ اور ترتیب زمانی میں انھوں نے جگہ سب سے آخر میں پائی لیکنؔ فضائل علمی اور محاسن سیرت کی ایک ایسی نادر روزگار شخصیت تھے کہ اگر پہلے آتے تو صدر نشیں بزم علمائے سلف ہوتے۔

تعلیم و تربیت مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم ۱۹۰۱ء میں گوجرانوالہ کی تحصیل وزیرآباد کے ایک گاؤں "ڈھونی کے" میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد ابراہیم تھا جو ایک متقی، عالم دین اور اپنے وقت کے اعلیٰ پایہ کے خوش نویس تھے۔ تعلیم کی ابتدار والد ماجد کی خدمت میں کی۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو انھیں حافظ عبدالمنان صاحبؒ کے مدرسہ

نصرۃ العلوم وزیرآباد میں داخل کردیا گیا۔ حافظ صاحب اپنے وقت کے بہت بڑے محدث تھے۔ ان کی خدمت میں تحصیل حدیث کے بعد انھوں نے سیالکوٹ، امرتسر، اور دہلی کا سفر کیا اور مشہور علمائے حدیث کی خدمت میں رہ کر فن حدیث میں تبحر حاصل کیا۔

صاحب استقامت

سنہ ۱۹۲۱ء سے انھوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا۔ گوجرانوالہ کو انھوں نے اپنی تبلیغی و تدریسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور کامل پچاس برس تک وہ نہایت انہماک، دلسوزی اور جاں کاہی سے دین وملت کی خدمات میں مصروف رہے اس مدت میں ملک میں بڑے بڑے انقلاب آئے" انھیں مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور عہدہ ومناصب کی ترغیب و تشویق کی آزمائشوں سے گذرنا پڑا لیکن نہ مصائب ان کے دل کو ہراساں کرسکے اور نہ کوئی ترغیب ان کے عزم کو متزلزل کرسکی۔ انھوں نے خدمت دینی کا جو عہد خدا سے باندھا تھا اس کے تقدس پر آنچ نہ آنے دی۔

جامع کمالات

ان کی خدمت کا کوئی ایک دائرہ اور کوئی ایک بندھا ٹکا اسلوب نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم وعمل کے بے شمار خصائص وکمالات سے نوازا تھا۔ وہ تمام علوم دینی ومعارف کتاب وسنت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ سیاست میں صاحب فکرورائے تھے، تحریر وتقریر میں انھیں یکساں کمال حاصل تھا۔ وہ بے پناہ علمی اور تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے جس شوق و انہماک

سے جماعت اہل حدیث کی تنظیم اور اسے ایک فعال جماعت بنانے میں حصہ لیا، اسی دلسوزی کے ساتھ تمام مسلمانوں کی اصلاح و تعلیم میں دلچسپی لی اور اسی جذبۂ صادق کے ساتھ تحریک آزادی اور ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں اپنا فرض ادا کیا۔ وہ جہاں اور جس دائرے میں رہے بلند و ارجمند رہے۔ جن افراد اور تحریکوں سے وابستہ ہوئے علم و بصیرت کے ساتھ نہ صرف ان کا ساتھ دیا بلکہ رہنمائی کی۔ ان کا دست تعاون پورے اخلاص کے ساتھ ہر کسی کی طرف بڑھا لیکن تقلید کی آلودگی سے ان کا دامن ہمیشہ پاک رہا۔ ان کے شاہین فکر کے لیے ان پستیوں میں بسیرا کرنا باعث ننگ تھا۔ ان کی نظر و بصیرت ہمیشہ تحقیق و اجتہاد کے جہان تازہ کی تلاش میں رہی۔ استخلاص وطن کی جد و جہد میں انھوں نے علمائے حق کے اس گروہ کا ساتھ دیا جو اپنی حق پرستی اور حریت نوازی میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے جس کا تعلق مختلف واسطوں اور سلسلوں سے حضرت اسمٰعیل شہید، شاہ عبدالعزیز اور حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے ملتا ہے۔ جمعیت علمائے ہند، مجلس خلافت، مجلس احرار اسلام وغیرہ ان کی سیاسی مساعی کے مختلف میدان تھے۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک لاتعاون سے لے کر ۱۹۵۲ء کی قادیانی تحریک تک تمام تحریکات میں حصہ لیا۔ وہ اپنی حریت نوازی اور جرم حق کوشی میں متعدد بار قید و بند کے مراحل سے گزر کر سنت یوسفی پر بھی عمل پیرا ہو چکے تھے؛

چند نامور تلامذہ انھوں نے اپنی تعلیم و تربیت سے سینکڑوں اصحاب

علم و عمل تیار کر دیے جنھوں نے ادب و شعر، تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور علمی و عملی زندگی کے مختلف گوشوں میں شہرت حاصل کی۔ ان کے تلامذہ میں مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا محمد اسحاق بھٹی، رشید اختر ندوی، پروفیسر غلام احمد حریری، مولانا قاضی مقبول احمد، مولانا ابو یحییٰ امام خاں، مولانا محمد اسمٰعیل ذبیح، حکیم عبد اللہ خاں نصر، مولانا محمد ابراہیم خلیل، مولانا عبد الرحمٰن واصل، مولانا ثناء اللہ، مولانا محمد عبد اللہ، مولانا معین الدین لکھنوی (اوکاڑوی) مولانا نور حسین گرجاکھی، مولانا حافظ عبد المنان، مولانا بشیر الرحمٰن، مولانا محمد الیاس ندوی، سید عبد الغنی شاہ کامونکی، شیخ عبد العزیز نجدی وغیرہم اہل علم کے علاوہ خود آپ کے صاحبزادگان گرامی پروفیسر مولانا محمد احمد، حکیم محمود صاحب اور محمد داؤد جو آپ کی اسلامی تربیت کا نمونہ ھیں، محتاج تعارف نہیں۔

علمی یادگاریں

مولانا محمد اسمٰعیل علیہ الرحمہ نے اپنے پیچھے صالح و سعید اولاد صلبی کے علاوہ بصورت تصانیف و مضامین اولاد معنوی بھی اپنی یادگار چھوڑی ہے جو لوگوں کی اصلاح اور ان کی ہدایت کا باعث ہوگی۔ مختلف علمی مباحث و موضوعات پر بعض دینی مسائل کی تشریح میں اور بعض غیر علمی خیالات کی تردید میں انھوں نے بہت سے بلند پایہ تحقیقی مقالات تحریر فرمائے جس میں سے بعض کتابچوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ چند یہ ہیں۔

اسلامی حکومت کا مختصر خاکہ مسئلہ حیات النبی، جماعت اسلامی کا

نظریۂ حدیث، حدیث کی تشریعی حیثیت، مقام حدیث قرآن کی روشنی میں، مسئلہ زیارت قبور، تحریک اہلحدیث اور اس کی خدمات، عید الفطر اور اس کے احکام و مسائل، تحریک آزادیٔ فکر اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تجدیدی مساعی (مسلک اہل حدیث پر مضامین کا مجموعہ) عید عہد نبوت میں، حجیت حدیث کے موضوع پر ایک اور معرکۃ آرا مضمون کے علاوہ تراجم و شروح میں جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں، مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ (تقریباً نصف) سبعہ معلقہ کا ترجمہ مع مقدمہ و تشریحات وغیرہ آپ کے آثار علمی ہیں۔

جماعت اہل حدیث

مولانا محمد اسمٰعیل علیہ الرحمہ نے جماعت اہل حدیث کی تنظیم، اس کی شاخوں کے قیام، مدارس دینیہ کے اجراء، مساجد کی تعمیر کے سلسلے میں تنہا جو کارنامہ انجام دیا وہ جماعتوں کی منظم کوششوں سے کرنے کا تھا۔ ان کی مساعی جمیلہ میں کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ گوجرانوالہ میں جب انھوں نے درس و تدریس اور تبلیغ و اشاعت کے میدان میں قدم رکھا تو بقول ایک فاضل مضمون نگار کے وہاں صرف سات اہلِ حدیث تھے اور ایک اہلِ حدیث مسجد تھی اور نصف صدی کے بعد جب انھوں نے اِس دار فانی سے رحلت فرمائی تو ۹۰ دیں مسجد زیر تعمیر تھی۔

عالم باعمل

مولانا محمد اسمٰعیل نے اہل حدیث کو منظم کیا۔ جماعت کی تشکیل کی مولانا داؤد غزنوی کو جماعت کا امیر مقرر کیا گیا اور مولانا علیہ الرحمہ

کو اس کی نظامت سپرد ہوئی۔ مولانا غزنوی کے انتقال کے بعد جماعت کی امارت کی ذمہ داری بھی آپ ہی پر آ گئی۔ صبح کو درس قرآن حکیم، جمعہ کو خطابت، عام دینی وسیاسی مجامع میں تقاریر، کانفرنسوں کا انعقاد، مدرسہ میں درس وتدریس اور جماعتی کاموں سے مسلسل سفر پھر ہر حالت میں مطالعہ وتحریر کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ زندگی کے ساتھ تھا۔

ان کی زندگی کی مصروفیت اور شب وروز کے معمولات دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ مولانا مرحوم نہایت مخلص، بے ریا، متواضع، خلیق، سادہ دل، نیک نفس، متقی، پرہیزگار، شہرت وناموری سے گریزاں اور عہدہ ومنصب سے بے نیاز، زاہد شب زندہ دار، تمسک بالکتاب اور عمل بالحدیث کے نہایت شائق اور فکر ونظر اور علم وعمل میں اسلاف کا کامل نمونہ تھے۔

سفر آخرت

بالآخر یہ آفتاب علم وفضل نصف صدی تک اپنی نورانی کرنوں سے دنیائے علم وعمل کو روشن کرنے اور عالم انسانی کو اپنی فکر ونظر سے راہ عمل دکھانے اور ہدایت وارشاد کے بعد ۲۱ فروری ۱۹۶۸ء کو غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا آزاد سے تعلق

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ومغفور سے مولانا محمد اسمٰعیل علیہ الرحمہ کو خصوصی تعلق تھا وہ ان کے علم وفضل، تدبر وبصیرت اور فکر ونظر کے بہت معترف تھے۔ مولانا آزاد مرحوم پر جب بھی کسی طرف سے کوئی حملہ ہوا، جماعت اہل حدیث

کے ترجمان الاعتصام نے ان کے دفاع کا فریضہ ادا کیا اور تدلیس وتلبیس کا پردہ چاک کر کے حق کو واضح اور آشکارا کر دیا۔

ملی وسیاسی معاملات میں وہ مولانا آزاد کی رہنمائی اور ان کی بصیرت وتدبر پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے مولانا علیہ الرحمہ کے دست حق پرست پر بیعت بھی کی تھی۔ حافظ احمد شاکر صاحب لکھتے ہیں:

"۱۹۲۱ء کو جب مولانا آزاد علیہ الرحمہ اپنی جماعت حزب اللہ کی بیعت کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے تو مولانا (محمد اسمٰعیل مرحوم) لاہور آئے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔"

محمد حنیف یزدانی صاحب لکھتے ہیں:

"تحریک آزادی کے دنوں میں انگریز کے خلاف جہاد کرنے کے لیے مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی۔"

لیکن جیسا کہ اس کتاب کے حصہ اول سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ یہ بیعت حزب اللہ میں شمولیت یا انگریزوں کے خلاف صرف جہاد کے لیے نہ تھی بلکہ یہ بیعت نظم جماعت کے لیے اپنی عملی وعلمی صلاحیتوں کو وقف کردینے اور کامل درجہ کی اسلامی وشرعی زندگی گزارنے کے متعلق تھی۔

کتابیات: مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی، الرحیم، حیدرآباد، مارچ ۱۹۶۸ء
محمد اسحاق بھٹی، امروز، لاہور ۲۹ فروری ۱۹۶۸ء، محمد حنیف یزدانی، چٹان لاہور ۶ مارچ ۱۹۷۲ء، حافظ احمد شاکر، الاعتصام لاہور، ۲۲ اگست ۱۹۶۹ء
شاہد اشرف، المنبر فیصل آباد، ۹ ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ

مولانا غلام رسول مہرؔ

مولانا غلام رسول مہر، مئی ۱۸۹۴ء میں ایک گاؤں پھول پور (ضلع جالندھر، مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد چند سال تک ریاست حیدر آباد میں پایگاہ وقار الامرا کے محکمۂ تعلیم سے وابستہ رہے اور انسپکٹر آف اسکولز کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ لیکن ملازمت کی پابندی ان کے مزاج کے خلاف تھی اس لیے اخبار جاری کرنے کے خیال سے ۱۹۲۱ء میں وطن لوٹ آئے۔

زمیندار سے تعلق

اس زمانے میں تحریک ترک موالات کا عروج تھا اور ہر شخص آزادی وطن اور اہل ملک کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھا۔ مہر صاحب ایک دوست کے مشورے کے مطابق نومبر ۱۹۲۱ء میں زمیندار کے ادارہ تحریر سے وابستہ ہو گئے لیکن والدہ اس تعلق پر راضی نہ ہوئیں۔ ۱۲ مہینے کے بعد خود زمیندار کے مینجر نے گاؤں پہنچ کر والدہ کو اس شرط پر راضی کیا کہ مہر صاحب کا رسمی تعلق زمیندار کے ساتھ نہ ہوگا۔ اس طرح فروری ۱۹۲۲ء سے یہ کام مستقل طور

پر سنبھالا اور ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء تک "زمیندار" سے وابستہ رہے۔ زمیندار اپنے وقت کا سب سے بڑا وقیع اردو اخبار تھا۔ یہ زمانہ ۱۹۲۱ء تھا تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات عروج پر تھیں۔

انقلاب کا اجراء تقریباً چھ سال تک زمیندار میں ادارتی فرائض انجام دینے کے بعد ۲ اپریل ۱۹۲۷ء سے مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کے اشتراک سے انھوں نے اپنا اخبار "انقلاب" نکالا جو اکتوبر ۱۹۴۹ء میں حالات کی نامساعدت کی بنا پر بند کر دینا پڑا۔ اس کے بعد مہر صاحب ہمہ تن تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

علمی و سیاسی خدمات مذہب، تہذیب، تمدن، تاریخ عالم، تاریخ اسلام، تحریک آزادئ ہند، اسلامیان ہند، مجاہدین آزادی اور متعدد علمی، ادبی، مذہبی، قومی شخصیات اور موضوعات پر ان کی نہایت بلند پایہ محققانہ تصانیف ہیں

مہر صاحب نے اب تک علمی، ادبی، تہذیبی اور وقتی حالات و مسائل پر صدہا نہایت فکر انگیز مقالات لکھے ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس وقت کہ ۱۹۷۰ء اپنا بیشتر سفر ختم کر چکا ہے اور قریب ہے کہ ۱۹۷۱ء کو جا ملے، پاکستان اور عالم اسلام کے حالات و مسائل پر ان کی شگفتہ نگاری اور عطر بیزئ افکار کا سلسلہ جاری ہے اور تاریخ و سیاست ملی کے سرائر و خفایا سے پردے اٹھا رہے ہیں۔

مہر صاحب تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد کتابوں کے مصنف، مرتب یا مترجم

ہیں۔ تاریخ اسلام خصوصاً مسلمانانِ ہند کی تاریخ پر اس وقت ان سے بڑا محقق کوئی نہیں۔ انھوں نے بیسویں صدی کے سیاسی، علمی، تہذیبی نشیب و فراز کو اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھا ہے بلکہ نصف صدی سے اِسی قلزم حوادث و انقلابات کے شناور ہیں۔

تاریخ دعوت اسلامی اور عزیمت دعوت کے سلسلے میں امام ابن تیمیہ اور سیرت سید احمد شہید ان کی بلند پایہ محققانہ تصانیف ہیں انداز و معیار اور جامعیت کے لحاظ سے اردو کا دامن ابھی تک اس پایے کی تصانیف سے خالی ہے۔ کلام اقبال اور دیوان غالب کی شرحیں نہ صرف صحت و کمال تشریح کے لحاظ سے بلکہ ادبی اور تنقیدی لحاظ سے نہایت اعلیٰ درجے کی شروح ہیں۔

صاحب طرز انشا پرداز مہر صاحب نے سوانح کے موضوع پر جو کتابیں تحریر فرمائی ہیں ان میں فنی نقطۂ نظر سے زندگی کے ہر پہلو سے بحث کی ہے اور ان کے معیار علم و تحقیق اور ترتیب و توازن کا پیمانہ ہر جگہ بلند ہے اور حسن تالیف اور اسلوب نگارش ہر مقام پر دامن قلب و نظر کو اپنی جانب کھینچتا ہے لیکن اصلاً وہ حسن فکر اور حسن سیرت کے عاشق ہیں اس لیے جہاں انھوں نے اس پہلو کا بیان اور اس گوشے کی نقاب کشائی کی ہے۔ وہاں ان کا حسن بیان اور انداز نگارش کمال دل فریبی و دل آویزی کی انتہائی بلندیوں پر رہے، اِن کے ندرت کار قلم کی اصل جولان گاہ کسی کے حسن فکر اور کمال سیرت کا تذکرہ ہے زبان نے

بیان پر اپنی بے پناہ قدرت، علم و مطالعہ کی بے اندازہ وسعت، کمال انشا پردازی اور طبع رسا و فکر بلند سے کام لے کر وہ اپنی جنبش قلم سے فکر و سیرت کا مینا بازار سجانے اور تاج محل تعمیر کرتے چلے جاتے ہیں۔

مہر صاحب اردو کے بلند پایہ ادیب، صاحب طرز انشا پرداز، صاحب فکر مورخ، نکتہ رس نقاد، عظیم صحافی اور ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ ان کی تحریریں استدلال کی پختگی اور کمال تربیت و تہذیب کا ایک عدیم المثال اور نادر الوجود نمونہ ہوتی ہیں۔ ماضی کے تذکار ہوں یا حدیث العہد مسائل و مباحث سیاست، چوں ان کی تحریر و تقریر میں طنز و مزاح کی ہلکی چاشنی ایک عجیب لطف دیتی ہے۔

بحیثیت شاعر

شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت زیادہ نہیں اور اب تو ایک مدت سے تصنیف و تالیف اور ترجمے کے کاموں کی مشغولیت میں یہ شوق چھوٹ چکا ہے لیکن وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر ہیں اور ان کا کلام وقت کے بلند پایہ ادبی رسائل میں چھپتا رہا ہے۔

وہ فارسی اور اردو شعر و ادب کا نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اردو اور فارسی کے علمی و ادبی خزائن و ذخائر پہ ان کے عبور کا تو کہنا ہی کیا، عربی اور انگریزی کی قدیم و جدید ادبیات اور تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔

علامہ اقبال سے تعلق

علامہ اقبالؒ سے انھیں بڑی عقیدت ہے۔ ایک مدت تک علامہ مرحوم سے دوستانہ تعلقات اور ہم مجلسی کا شرف حاصل رہا۔ گول میز کانفرنس میں وہ علامہؒ کے ساتھ تھے۔ لکھتے ہیں:۔

"۱۔ مجھے اور علامہ مرحوم کو موتمر اسلامی فلسطین میں شریک ہونا تھا۔

۲. علامہ مرحوم کو روما بلایا گیا تو انھوں نے مجھے دعوت میں شامل کر لیا اور منظوری آگئی تو مجھے اطلاع دی۔ جاتے وقت میں اطالوی جہاز سے گیا اور نیپلز اتر کر اٹلی کی سیر کی۔ پھر پیرس میں ٹھہرا رہا۔ بعد ازاں لندن گیا۔ حضرت علامہ مرحوم سیدھے پارسائی (جسے مارسیلز کہتے ہیں) گئے اور وہاں سے ریل پر سوار ہو کر کیلے بعد ازاں لندن چلے گئے۔ علامہؒ کا ہم سفر صرف واپسی میں تھا۔"

علامہ مرحوم کی زندگی، ان کی شخصیت، ان کے شاعرانہ کمال اور ان کی ادبی و سیاسی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر پچاسوں مقالے اب تک ان کے قلم سے نکل چکے ہیں اور علامہ کے کلام کی شرحیں اہل علم میں مقبول ہو چکی ہیں۔

غالب

اقبالؒ کی طرح انھیں غالب سے بھی بڑی عقیدت ہے۔ غالب کی شخصیت و فن پر اب تک دہائیوں سے متجاوز نہایت محققانہ اور تنقیدی مقالات ان کے قلم سے نکل چکے ہیں۔ غالب پر ان کی سوانحی کتاب کو غالبیات میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ نیز غالب کے خطوط، دیوان غالب، کلیات غالب، اور فارسی تحریروں کی ترتیب ان کی قابل قدر ادبی خدمت ہے۔ ان کے خامہ گہر بار سے دیوان غالب کی ایک بے مثال شرح بھی ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم اور اصحاب ذوق میں شرف قبول حاصل کر چکی ہے۔

مولانا آزاد سے رشتۂ نیاز

اقبال رح اور غالبؔ کے علاوہ عہد جدید کی شخصیتوں میں مولانا ابوالکلام آزاد سے

مہر صاحب بہت متاثر ہیں۔ مولانا سے ان کا پہلا باقاعدہ تعارف ۱۹۱۴ء میں ہوا، اس سے پیشتر ۱۹۱۲ء میں مہر صاحب "حزب اللہ" کے ممبر بن چکے تھے۔ جب وہ بی اے کے آخری سال میں تھے تو مولانا آزاد نے ان کے بارے میں پیشین گوئی فرمائی تھی،

"اگر غفلت طاری نہ ہوئی تو میں آپ کے اندر عظیم الشان مستقبل کے آثار دیکھ رہا ہوں۔"

نصف صدی میں ان کے علمی، ادبی کارنامے اور سیاسی، صحافتی تاریخی اور دینی خدمات مولانا کی اس پیشن گوئی پر شاہد عدل ہیں۔

کمالِ وضع داری کا نمونہ

مہر صاحب مولانا کے مرید بھی ہیں۔ بیعت کی سعادت انھیں ۱۹۲۳ء میں حاصل ہوئی تھی۔ مولانا سے ابتدائے تعارف سے انتقال تک تقریباً پینتالیس برس رشتۂ ارادت و عقیدت قائم رہا۔ اس مدت میں بارہا ایسے مواقع پیش آتے کہ ملکی و سیاسی معاملات میں انھوں نے مولانا سے اختلاف کیا لیکن ان کے رشتۂ ارادت اور علاقۂ عقیدت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ مولانا کی رائے سے اختلاف کے باوجود مولانا کی عظمت، دینی وجاہت، سیاسی و ملکی خدمات اور محاسن اخلاق و سیرت کے اعتراف میں ان کی زبان اور ان کے قلم نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔

چند خاص علمی کام

مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ایک درجن سے زائد بلند

پایہ اور نہایت لاجواب مقالات انکے قلم فیض ترجمان اور خامہ گہربار سے نکل چکے ہیں اپنے نام مولانا کے مکاتیب کا مجموعہ "نقش آزاد" کے نام سے اور چند دیگر اکابر و مشاہیر کے نام مکاتیب اور مولانا کی بعض تاریخی تحریروں کا مجموعہ "تبرکات آزاد" کے نام سے ترتیب دیکر چھپوا چکے ہیں نیز ترجمان القرآن کی تیسری جلد سے متعلق متفرق سور و آیات کے تراجم و تشریحات "باقیات ترجمان القرآن" کے نام سے ترتیب دے کر ناقابل فراموش اور قابل ستائش دینی خدمت انجام دی ہے۔

اِس کے علاوہ پچھلے کئی سال سے وہ مولانا کے افادات کی ترتیب کا کام انجام دے رہے ہیں ان میں سے سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر مولانا کی تحریروں کی ترتیب کا کام بھی ہے۔ مولانا کی یہ تحریریں اگرچہ سیرت پر کام کے لیے عظیم الشان منصوبے کے مطابق تھیں لیکن خود اِن میں کوئی ربط نہ تھا۔ یہ سیرت کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ مقالات تھے۔ مہر صاحب نے اِن تمام تحریروں کو ایک خاص ترتیب سے جمع کیا اور ان کے درمیان کے خلاؤں کو پُر کر کے اِس طرح مسلسل و مربوط کر دیا کہ یہ اضافے مولانا کی تحریروں میں ربط کا کام بھی دیں اور ان سے ممیز بھی رہیں اور مولانا کی تحریروں سے خلط ملط نہ ہو جائیں اِس طرح مہر صاحب کی سعی و کاوش نے مولانا کی متفرق تحریروں کو ایک مربوط و مبسوط تصنیف کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ سیرت پر یہ بے نظیر کام پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور عن قریب شائع ہونے والا ہے۔[۱] اِس سے اندازہ ہو گا

---

[۱] یہ کتاب رسول رحمت کے نام سے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔

کہ مولانا" سیرت نبوی کے علم و مطالعہ کو علوم اسلامیہ میں کتنی اہمیت دیتے تھے اور اس کے لیے ان کے سامنے ایک عظیم الشان منصوبہ تھا۔ اسی قسم کا ایک کام سیرت انبیاء کے متعلق ترتیب و تہذیب کے مراحل سے گزر کر کتابت کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔[۱]

مہر صاحب نے اقبالیات آزاد کی ترتیب سے صرف اپنی عقیدت و محبت ہی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ اہم موضوعات پر بہترین تحریروں کے انتخاب و ترتیب سے بہت بڑی دینی اور علمی خدمت بھی انجام دی ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کاموں کی اہمیت کا کوئی اندازہ شناس نہیں۔ مہر صاحب کی ان خدمات جلیلہ و عظیمہ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

نادر الوجود شخصیت

مہر صاحب اس عہد کی ایک جامع حیثیات اور نادر الوجود شخصیت ہیں اللہ تعالیٰ نے انھیں صحت فکر کی دولت اور حسن عمل کی توفیق سے نوازا ہے۔ وہ نہایت وسیع المطالعہ، باریک بین، بیدار مغز، قوی الحافظہ اور حیرت انگیز استحضار کی صلاحیت کے مالک ہیں۔

علم و فکر کی دولتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انھیں اخلاق و سیرت کے کمالات و خصائص سے بھی نوازا ہے۔ وہ نہایت با اخلاق، صاحب مروت فراخ دل، دوستوں سے انتہائی محبت کرنے والے، نیاز مندوں کے لیے سراپا

سراپا شفقت، نہایت شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور باغ و بہار شخصیت ہیں ان کی صحبت کبھی کسی کے لیے بارِ خاطر نہیں ہوتی۔

اردو زبان و ادب کی کوئی تاریخ، کوئی علمی و سیاسی تذکرہ، اسلامی ہند کی تاریخ تہذیب و ثقافت اور کوئی دائرۃ المعارف مہر صاحب کی شخصیت اور خدمات کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔[۱]

---

[۱] یہ مضمون مولانا مہر صاحب مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا تھا اور برہان دہلی میں چھپ گیا تھا۔ اس لیے اسے جوں کا توں رہنے دیا افسوس کہ علم و ادب کا یہ مہر عالم تاب ۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء میں ہمیشہ کے لیے دنیا کی نگاہوں سے غروب ہو گیا۔

مستری محمد صدیق

حالاتِ زندگی

مستری محمد صدیق سلطان پور لودھیاں کے ریاست کپورتھلہ کے باشندے تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں ایک عرصہ تک بنارس میں رہے۔ کچھ عرصہ کلکتہ اور دھلی میں مقیم رہے اور پھر اپنے آبائی وطن لوٹ آئے۔ ۱۹۲۵ء میں سلطان پور اور کپورتھلہ کے درمیان میں آدمی کھوتی کے مقام پر رہنے لگے اور خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنا لیا وہ بِلا تفریق مذہب و ملت ہر کسی کی خدمت کے لیے ہر وقت مستعد رہتے۔ ۱۹۴۷ء میں جن سنگھ کے کارکنوں نے ان پر ریوالور سے حملہ کر کے انھیں زخمی کر دیا لوگ انھیں کپورتھلہ کے ہسپتال لے گئے۔ مشرقی پنجاب میں اِس وقت فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی اور مسلمانوں کی جان و مال محفوظ نہ تھے۔ صحت یابی کے بعد مستری صاحب دھلی چلے گئے۔ اور وھاں سے پاکستان آگئے۔

پہلے لاہور میں قیام کیا۔ پھر کراچی آگئے اور کچھ عرصہ قیام کر کے سندھ میں جنگ شاہی میں جاکر مقیم ہوگئے۔ بعد ازاں چوہدری نیاز علی صاحب کی دعوت پر خوشاب چلے گئے اور سون سیکسر کے پہاڑوں میں ایک جگہ پسند کر کے مقیم ہوگئے۔ ۱۱ اگست ۱۹۵۲ء کو یہیں انتقال ہوا اور

خوشاب میں تدفین ہوئی

وقت کا ابوذرؓ

مستری محمد صدیق صاحب بڑے مخلص اور بے مثال انسان تھے۔ ان کی زندگی خدمت خلق کے لیے وقف تھی۔ خدا ترسی اور انابت الی اللہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ انقلابی ذہن رکھنے والے درویش صفت بزرگ تھے۔ اپنے خیالات اور اپنی زندگی کے لحاظ سے وہ اپنے عہد کے حضرت ابوذر غفاریؓ تھے۔ ہمیشہ ایسی سوسائٹی کی تلاش میں رہتے تھے جو دینی تصورات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔ اسی سلسلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملے جماعت اسلامی میں شامل ہوئے کچھ عرصہ جماعت اسلامی کے دارالاسلام پٹھان کوٹ میں بھی مقیم رہے تھے لیکن جس یوسف مقصود کی تلاش میں وہ یہاں پہنچے تھے وہ یہاں نہیں ملا۔

مولانا آزاد سے تعلق

مستری صاحب کا تعلق اُن السابقون الاولون میں سے تھا جنھوں نے سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کی دعوت پر لبیک کہا اور اپنا سب کچھ لٹا کر حزب اللہ میں شامل ہونے کے لیے کلکتہ گئے اور مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس وقت سے لے کر آخر وقت تک انھیں مقاصد کے لیے کام کرتے رہے۔ مولانا آزاد کے افکار و خیالات سے وہ بہت متاثر تھے۔ اِن کی مکتبی تعلیم زیادہ نہ تھی البتہ مولانا آزاد کی صحبت نے انھیں فکر اور انداز فکر کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ دارالرشاد کلکتہ

میں جن مخلصین صادقین نے مولانا سے قرآن حکیم کے رموز و نکات اور شریعت کے اسرار و حکم سیکھے تھے مستری صاحب ان ہی خوش نصیبوں میں سے تھے۔ وہ مولانا کی روحانیت، علم و فضل، فکر و فہم اور صحت نظر کے بیحد معترف اور ان کے محاسن اخلاق و سیرت اور عزیمت کے بہت مداح تھے۔ حضرت مولانا بھی ان پر بے حد اعتماد کرتے تھے ایک مدت تک مولانا کے ساتھ رہے اور بہت سی باتوں میں ان کا ذہن بالکل مولانا کے ذہنی سانچے کے مطابق ڈھل گیا تھا۔ ساری زندگی عسرت اور تنگ دستی میں گزری لیکن اپنی قناعت و خود داری کی آن میں فرق نہ آنے دیا۔

مولانا آزاد سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ مولانا آزاد سے ہر کوئی ہر وقت نہ مل سکتا تھا لیکن مستری صاحب کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی وہ جب چاہتے چلے جاتے اور جس وقت چاہتے مل لیتے۔

شکل و شمائل

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی نے ان کا قلمی چہرہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"میانہ قد، گداز بدن، لمبوتری سفید داڑھی، سر بھی سفید اور عموماً ٹانی کی عنایت سے بے نیاز، بڑی بڑی رسیلی آنکھیں، گندمی رنگ، سفید کھدر کا کرتا اور اسی کا شرعی پاجامہ، چمڑے کا جوتا، کبھی برہنہ سر، کبھی عمامہ بر سر۔"

اسلامی سیرت کا نمونہ اور ان کی سیرت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"خودداری میں ابوالکلام، سادگی میں حسرت موہانی، معاشی افکار میں پرتو ابوذر غفاری، انقلابی ذہن میں سبھاش چندر بوس، قناعت اور بے نیازی میں قلندر صفت، یادِ خدا میں مست، علم لدنّی کے حامل، تفسیر میں بحر مواج، گفتگو میں بیشتر رموز کا سا انداز، نڈر، صاف گو، بے ریا، مخلص، مدلل اور معقول بات کو فوراً تسلیم کر لینے والے یہ تھے مستری محمد صدیق"[1]

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

---

[1] مستری محمد صدیق مرحوم کے تذکرے کی تالیف میں مولانا نصراللہ خان عزیز کے سلسلہ مضمون "زندگانی کی گزرگاہوں میں" مطبوعہ ایشیا لاہور، خصوصاً شمارہ بابت ۲۴ دسمبر ۱۹۵۹ء از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی کے مضمون مطبوعہ المنبر فیصل آباد ۱۹ فروری ۱۹۶۵ء سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔

عزیز ہندی مرحوم

غلام محمد نام اور عزیز تخلص تھا۔ کابل میں عزیز ہندی کے نام سے معروف ہوئے اور پھر ان کا یہی نام ہندپاکستان میں بھی شہرت پا گیا۔ امرتسر کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں وہ ایک تجارت پیشہ متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کو اگرچہ ملک کی سیاسی سرگرمیوں سے دلچسپی نہ تھی لیکن عزیز ہندی نے جس دور میں شعور کی آنکھیں کھولی تھیں، ناممکن تھا کہ وہ اپنے دل و دماغ کو باہر کی ہواؤں اور گردوپیش کے اثرات سے محفوظ رکھتے۔ طرابلس پر اٹلی کا حملہ، ریاست ہائے بلقان میں ترکوں کے خلاف انگلستان، فرانس اور دوسری مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں، ترکوں کی مجبوری و بے بسی، مصر پر انگریزوں کا قبضہ، ایران میں انگریزی تسلط، افغانستان میں برٹش ڈپلومیسی کی چالیں، تیونس اور مراکش پر قبضہ، عراق، شام، لبنان اور حجاز میں فرنگی سازشیں اور ترکوں کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکانے کی کوششیں اور پھر اندرون ملک رہنماؤں کی قید و نظر بندی، مطابع کی ضبطی، اخبارات کی بندش وغیرہ کے بیسیوں واقعات صرف بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے ہیں۔ پھر ترکوں سے ہمدردی اور ان کی امداد و اعانت کے لیے جوش و سرگرمی، عالم اسلام اور ترکی خلافت کو انگریزوں کے

جبر و تسلط سے بچانے کے لیے اسلامی ہند کے جذبۂ ایثار و خدمت گزاری کے ولولہ انگیز مناظر، مچھلی بازار کانپور کے حادثۂ انہدام اور جلیانوالہ باغ میں انگریزی استعمار کے ظلم و بربریت کے ظہور و شیوع کے المناک واقعات، برٹش استبداد کے مقابلے کے لیے عوام کا جذبۂ جاں سپاری، استخلاص وطن کے لیے جوش و ولولہ، ابوالکلام کی صدائے درد انگیز، حسرتؔ کی دعوتِ انقلاب، محمد علیؔ کے نعرۂ رستاخیز، شبلیؔ کی اشک ریزیوں، ظفر علیؔ کی خوں فشانیوں اور بہت سے ہمنایانِ قوم اور بہی خواہانِ ملت کے غم و الم سے معمور فضا سے کوئی قلبِ سلیم کیونکر متاثر نہ ہوتا۔ یہی زمانہ عزیزؔ ہندی کے بلوغِ شعور کا تھا۔ وہ ملت کے غم میں اپنے دردمند دل کو تڑپنے سے اور اپنی آنکھوں کو اشک افشانیوں سے نہ روک سکے انھوں نے ملت سے عشق کا دعویٰ کیا تھا تو ضروری تھا کہ اس دعوے کی سچائی کو پرکھا جائے۔ چنانچہ جلیانوالہ باغ کے حادثے کے دوسرے ہی روز انھیں گرفتار کر لیا گیا اور عدالت سے بیس سال قید با مشقت کا انعام ملا۔ سزا کا حکم سننے کے بعد ملک کی آزادی اور ملت کے عشق کا شعلہ سرد نہیں پڑ گیا بلکہ ظلم کے اس وارنے اسے اور بھڑکا دیا لیکن آزمائش کا یہ دور آٹھ ماہ سے زیادہ طویل نہیں ہوا۔ یہ قدرت کی کارفرمائیاں اور اس کا اپنے پاکباز بندوں پر انعام ہے کہ خدمتِ حق کے راستے میں جب کوئی شخص ثابت قدم رہتا ہے تو اس کی دستگیری کا ظہور ہوتا ہے اور ایک طرف تو وہ حق پرست بندوں کے قلوب کو استقامت و سکینت سے معمور کر دیتا ہے۔ دوسری طرف ظالموں کو ان کے ظلم کے انجام کی ایک ایسی جھلک دکھاتا ہے کہ ان کے اٹھے ہوئے

ہاتھ رک جاتے ہیں اور بڑھے ہوئے قدم پیچھے ہٹنے لگتے ہیں اور جن ہاتھوں سے حق پرستوں کے لیے پہلے جیل خانوں کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور صلیبیں کھڑی کی جاتی ہیں انھی سے زنجیریں کاٹی جاتی اور انھیں آزادی کے پروانے دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ قدرت کی یہی دستگیری تھی کہ جلیانوالہ باغ کے سلسلے میں گرفتار شدگان کی عام معافی اور رہائی کا اعلان ہوا اور عزیز ہندی بھی رہا کر دیے گئے لیکن انھوں نے قید کے زمانے میں خدا سے خدمتِ حق کا جو عہد باندھا تھا اس کی تکمیل کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا اور حیاتِ مستعار کے آخری لمحوں تک اس عہد کو نبھایا۔

۱۹۱۹ء کے اواخر میں اپنی پہلی قید سے رہائی کے بعد ان کی زندگی کا وہ طوفانی دور شروع ہوا جو ان کی وفات پر ختم ہوا۔ رہائی کے بعد وہ بہت جلد حریت پرستوں اور آزادی طلبوں کے حلقے سے مشہور ہو گئے۔ خلافت کمیٹی اس وقت مسلمان آزادی خواہوں کی سب سے بڑی جماعت تھی، اس نے عزیز ہندی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ فروری ۱۹۲۰ء میں خلافت کانفرنس بمبئی میں شریک ہوئے پھر جب اپریل میں بعض خلافتی رہنماؤں نے کنونشن بلایا تو اس میں وہ شریک ہوئے۔ انھی دنوں میں دہلی سے انھوں نے ہجرت کرنے والوں کے انتظامات کے لیے مراکز قائم کیے۔ عزیز ہندی مرحوم میں جوشِ اسلامی اور ولولۂ خدمتِ ملت کی کمی نہ تھی، اخلاص و ایثار کے بہترین خصائص سے وہ بہرہ مند تھے لیکن ایک ملک گیر تحریک کو چلانے کے لیے ایک صاحبِ نظر و تدبّر اور ضابطہ و منتظم شخصیت کی ضرورت تھی۔ اس لحاظ سے اس چوبیس سالہ جو ہرِ قابل کی ابھی

تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حالات کا اندازہ کر کے مولانا ابوالکلام آزاد نے اس تحریک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ عزیز ہندی صاحب لکھتے ہیں:

"مسلمان ہزاروں کی تعداد میں اپنا گھر بار چھوڑ کر افغانستان کی طرف ہجرت کر کے جانے لگے۔ عین اس حالت کو دیکھ کر خود مولانا ابوالکلام آزاد نے سیاسی اور دینی لیڈر ہونے کی حیثیت سے ہجرت کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھوں میں لے لی اور ہر ایک صوبے میں اپنی طرف سے ناظم مقرر کر دیے تاکہ ہجرت کا سلسلہ ایک منظم طریق پر جاری رکھا جائے اور صرف وہی لوگ ہجرت کر پائیں جو کارآمد ہوں۔ پنجاب کا ناظم مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو مقرر کیا گیا۔ انھی نے ہجرت کے جلسوں کی دہلی میں صدارت کی تھی اور انھی کے زیرِ صدارت ہجرت کرنے کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا۔" [1]

جون ۱۹۲۰ء میں عزیز ہندی نے بھی اپنے چند رفقاء کے ساتھ ہجرت کی اور کابل پہنچ کر مہاجرین کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا لیکن انھیں بہت جلد حالات کی سنگینی کا احساس ہو گیا تقریباً دو لاکھ مسلمان ہند پاکستان میں اپنا گھر بار لٹا کر کابل پہنچ چکے تھے۔ اس عظیم تباہی و بربادی کا کوئی مداوا نہ تھا۔ تحریک ہجرت ناکام ہو گئی۔ وہ مسلمان جنھوں نے اپنے گھر بار کے ساتھ

---

[1] عزیز ہندی، تحریک ہجرت کی تاریخ، مشمولہ "اوراق گم گشتہ" محمد علی اکیڈیمی لاہور، ۱۹۶۸ء، صفحہ ۶۵

ہجرت کی تھی وہ ہندوستان لوٹ آئے جو گھر بار کی ذمہ داریوں سے آزاد تھے ان میں سے بہت سے افغانستان میں ٹھہرے رہے، کچھ روس چلے گئے۔ عزیز ہندی کے لیے وطن واپس آنا آسان نہ تھا۔ افغانستان میں انھوں نے فوجی تربیت حاصل کر لی تھی۔ جمال پاشا کے بریگیڈ میں وُہ کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی طبیعت خدمتِ ملّت کے ایک نئے میدان کی متلاشی تھی۔ کابل برٹش ڈپلومیسی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ان کے لیے وہاں رہ کر اپنے ملک کی آزادی یا افغانستان کی ترقی اور اس کی آزادی کے استحکام کے لیے آزادانہ طور پر کچھ کرنا ممکن نہ تھا اس لیے وہ روسی حکومت سے ایک معاہدے کے بعد آزاد قبائل کو مسلح کرنے اور انھیں فوجی تربیت دینے کے لیے مجاہدین کے مرکز چمرقند چلے گئے اور ایک مدت تک وہ اس کام میں مصروف رہے۔ ان کے حالات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ برٹش ڈپلومیسی ان کے تعاقب میں تھی اور انھیں قابلِ اعتماد ساتھیوں کی کوئی جماعت میسر نہ آسکی اس لیے ان کا یہ منصوبہ اور بہت سے دوسرے منصوبے ادھورے ہی رہ گئے۔ پھر بھی انھوں نے انتہائی ہمت شکن حالات میں جو کچھ کیا وُہ ان کا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ افغانستان کی آزادی اور ترقی کے لیے انھوں نے عظیم الشان خدمات انجام دیں جس کا اعتراف افغانوں نے بھی کیا لیکن عزیز ہندی ایک انقلابی طبیعت کے نوجوان تھے، پابندیوں کو قبول کرنا اور افغانستان کے مخصوص مفادات کے لیے ملت اسلامیہ ہندیہ اور عالم اسلامی کے وسیع مفادات کو نظر انداز کر دینا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ ملت کے عشق اور خدمتِ حق کے جذبے نے انھیں اپنے وطن اور گھر کی عیش و عشرت کی

زندگی چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ افغانستان میں راحت طلبی کو وہ اپنی زندگی کا مقصد کیوں کر قرار دے سکتے تھے۔ اس لیے افغانستان میں انھیں شدید ترین مخالفتوں اور سنگین حالات کا مقابلہ کرنا پڑا اور وہ متعدد بار کئی کئی سال تک قید و نظر بند رہے۔ آخری مرتبہ وہ ۱۹۴۱ء میں جب کہ وہ آزاد قبائل میں بعض علمی خدمات میں مصروف تھے، افغانستان کے بعض مفاد پرستوں نے انھیں اغوا کر لیا اور ۱۹۶۶ء تک وہ سترہ برس مسلسل افغانستان کی جیل میں رہے۔ اس دوران میں کسی کو ان کے بارے میں کچھ علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں؟ زندہ ہیں یا وفات پا چکے ہیں۔ اس سے قبل وہ ہندوستان میں ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک متعدد بار قید و نظر بند ہو چکے تھے۔ ان کی زندگی کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ ملتِ اسلامیہ کے عشق میں قید و بند کی نذر ہو گیا۔

مولانا ابو الکلام آزاد سے وہ بہت متاثر تھے ان سے غائبانہ تعارف تو ۱۹۲۰ء سے بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن پہلی ملاقات فروری ۱۹۲۰ء میں بمبئی میں ہوئی۔ اس ملاقات کی روداد عزیز ہندی کے الفاظ میں پڑھیے۔ لکھتے ہیں:

> "اس شہر (بمبئی) کو انھوں نے (مولانا شوکت علی نے)
> اپنی تحریکِ خلافت کے مرکز کے طور پر چنا اور فروری ۱۹۲۰ء
> میں آل انڈیا بنیادوں پر پہلی خلافت کانفرنس کے منعقد کرنے
> کا اعلان کر دیا..... میں اس کانفرنس میں آل انڈیا خلافت
> کمیٹی کا ممبر منتخب ہوا تھا اور اس کانفرنس میں میں مولانا ابو الکلام
> آزاد کی شخصیت سے پہلی بار ملاقی ہوا۔ اس سے پہلے میں

علی برادران سے امرتسر میں مل چکا تھا اور ایک ورکر کی حیثیت سے ان کی خدمت میں عرض کر چکا تھا کہ مجھے اپنی سرپرستی میں لے کر میری تجویت کریں کیونکہ میں دین کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا چاہتا ہوں۔ خدا اغریق رحمت کرے مولانا محمد علی کو کہ انھوں نے یہ سُن کر مجھے "خوفناک دیوانہ" کے نام سے یاد کیا۔ عجیب بات ہے کہ انگریزوں نے بھی کچھ عرصے بعد مجھے "خوفناک آدمی" کہہ کر پکارا ......" [1]

مولانا ابوالکلام آزاد سے میرا آمنا سامنا ایک نہایت ہی ڈرامائی صورت میں ہوا۔ ہم سبجکٹ کمیٹی میں مدعو تھے۔ بعض کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لا رہے ہیں۔ مولانا آئے اور ایک کرسی پر آن کر بیٹھ گئے۔ میری یہ اوّلین دید تھی۔ ان کی شخصیت بڑی جاذب اور دلکش تھی۔ شوق اور جوشِ عقیدت سے میری ٹکٹکی ان کی طرف بندھ گئی۔ میں نے حیرت کے ساتھ محسوس کیا کہ وہ بھی اس بھرے مجمع میں بار بار صرف میری طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔ یقیناً اس وقت تک انھوں نے میرا نام بھی نہ سنا ہو گا اور میں اپنے موجودہ نام سے اس وقت تک معروف بھی نہ ہُوا تھا۔ مجھے اس وقت تک

---

[1] عزیز ہندی، تحریک ہجرت کی تاریخ، مشمولہ اوراقِ گم گشتہ، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۶۵۔

لوگ غلام محمد عزیز کہہ کر پکارتے تھے میرا موجودہ نام "عزیز ہندی" کابل (افغانستان) میں جا کر معروف ہوا۔ انگریزی ریکارڈ میں مجھے "غلام محمد المعروف عزیز ہندی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

الغرض! باہمی جذب و شوق اس امر پر منتج ہوا کہ دوسرے دن میں ان سے ملنے کے لیے بمبئی سے ماہم گیا جہاں وہ مولانا عبدالقادر قصوری کی جائے رہائش پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ماہم ان دنوں بمبئی کے اطراف میں ایک خوب صورت قصبہ تھا جہاں اکثر متمول لوگوں نے اپنے بنگلے بنا رکھے تھے۔ مولانا عبدالقادر قصوری کا خاندان اسی قصبے میں اپنی کاروباری مصروفیتوں میں مشغول تھا مولانا ابوالکلام جب کبھی بمبئی تشریف لے جاتے تو انھی کے مہمان ہوتے۔ مولانا عبدالقادر قصوری کو بھی مولانا ابوالکلام آزاد سے گہری عقیدت تھی۔ جب میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے گیا تو وہ اپنے عقیدت مندوں سے خلوت میں بات چیت کر رہے تھے۔ میں نے اپنی اطلاع کروائی تو انھوں نے مجھے بھی اندر بلا لیا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے اُن سے عرض کیا کہ میں کچھ خلوت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا اسے بھی خلوت ہی سمجھیے اور پھر تھوڑی دیر سکوت کے بعد کہا کہ میں ابھی ابھی بمبئی جا رہا ہوں آپ میرے ساتھ چلیے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ماہم کے

اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے پیش دستی کر کے فرسٹ کلاس کی دو ٹکٹیں خریدیں اور پھر گاڑی میں سوار ہو کر بمبئی کی طرف چل پڑے۔

راستے ہی میں میں نے انھیں اپنا ماجرا سنایا کہ میں کس طرح مارشل لاء میں قید ہوا اور کیسے رہا ہوا۔ میں نے انھیں اپنا وہ بیج بھی دکھایا جو انڈین نیشنل کانگریس نے مارشل لاء کے قیدیوں کے لیے بنوایا تھا اور جس پر کلابتوں کی ڈوری سے انگریزی میں (MARTER OF FREEDOM) شہید آزادی کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے اپنے خاندانی کوائف بھی بیان کیے اور کہا کہ میں ایک کاروباری گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے اس عہد کا ذکر کیا جو میں نے جیل کی چاردیواری میں اپنے خدا سے باندھا تھا اور یہ کہتے ہی میں نے جوشِ عقیدت سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ میری تربیت کیجیے میرا جوشِ عقیدت دیکھ کر انھوں نے مجھے مشفقانہ نگاہوں سے دیکھا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ اپنی آغوشِ تربیت میں لینے کے لیے فوراً ہی اپنی آمادگی کا اظہار کریں گے۔ لیکن انھوں نے اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا تھا کہ گاڑی بمبئی کے گرانٹ روڈ اسٹیشن پر آ کر رک گئی۔ یہیں ہمیں اترنا تھا۔ ہم اتر کر سیدھے سبجیکٹ کمیٹی کی جلسہ گاہ کی طرف چلے گئے۔ پھر راستے میں کوئی

بات نہ ہو سکی تھی۔ لہ

مارچ ۱۹۲۰ء میں وہ مولانا آزاد سے کلکتہ میں ملاقی ہوئے اس موقع پر مولانا نے انھیں حلقہ بیعت میں شامل کر لیا۔ عزیز ہندی لکھتے ہیں:

"جب میں فروری ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کے موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقی ہوا جن کے تبحر علمی کا ہر ایک کو اعتراف تھا تو میرے دل میں ان سے فیض حاصل کرنے کی خواہش بھی پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار ان سے بمبئی میں کیا تھا۔ لیکن چونکہ فیصلہ کی بات وہاں ہمارے درمیان طے نہ پائی تھی۔ اس لیے میں مارچ کے مہینے میں دوبارہ کلکتہ میں ان سے ملاقات کی غرض سے گیا تھا۔ انھوں نے وہاں اپنے ہاتھ پر مجھ سے بیعت تو لے لی تھی مگر ساتھ ہی مجھے گھر واپس جانے کا حکم بھی دے دیا تھا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل تو کر دی تھی لیکن میرے دل کو اس سے کوئی تسکین حاصل نہ ہو سکی تھی۔" ٢ہ

عزیز ہندی مرحوم ایک دردمند مسلمان تھے۔ وہ انقلابی ذہن رکھنے والے اور پختہ عزم کے مالک تھے۔ انتہائی ہمت شکن حالات میں بھی وہ نہ گھبراتے

لہ تحریک ہجرت کی تاریخ ص ۶۲ - ۶۱ء

٢ہ ایضاً ص ۶۷ء

نمایاں ہوتے۔ وہ اخلاص عمل کا پیکر تھے۔ دین دار اور متقی انسان تھے۔ مسلمانوں کی خدمت اور ان کی سربلندی کے لیے ہمہ وقت مستعد اور ہمیشہ نئے میدانِ عمل کے متلاشی رہتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے بھی قریب ہوتے گئے۔ مولانا مودودی کی تحریک اسلامی میں اُن کے لیے کیا کشش تھی وہ کن جذبات صادقہ کے ساتھ اس میں شامل ہوتے تھے اور اس حلقے میں کس طرح اُن کی پذیرائی کی گئی۔ اس کی تفصیل مولانا مودودی کی زبانی سُنئے لکھتے ہیں:

"ہمارے رفقاء میں ایک تازہ اور قیمتی اضافہ جناب عزیز ہندی کا ہے۔ ان کے نام سے ہندوستان کے اخبار بیں حضرات ناآشنا نہیں ہیں۔ یہ ۱۹۲۰ء کی تحریک ہجرت کے علم بردار تھے تقریباً دو لاکھ آدمیوں کے ساتھ ہجرت کر کے افغانستان تشریف لے گئے۔ وہاں جمال پاشا کے زیرِ سرپرستی انھوں نے فوجی تعلیم حاصل کی اور عساکرِ افغانیہ میں داخل ہو کر کرنل کے درجے تک ترقی کی۔ وہیں ان کو دنیائے اسلام کے آزاد ممالک کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ جس نے روز بروز یہ حقیقت ان پر واضح کر دی کہ احیائے ملت اسلامیہ کے لیے ان آزاد ممالک کی فضا ہندوستان سے بھی زیادہ ناسازگار ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے کئی سال تک نظامِ اشتراکیت کا نہ صرف علمی حیثیت سے مطالعہ کیا بلکہ اس کے عملی پہلو کو بھی

بہت قریب سے دیکھا۔ اور اس مطالعے نے آخرکار ان کو بربنا اعتقاد نہیں بلکہ علی وجہ البصیرت اس نتیجے پر پہنچایا کہ نظامِ اسلامی کے مقابلے میں نظامِ اشتراکی ہر حیثیت سے ناقص ہے مگر دنیا اس ناقص نظام کی طرف صرف اس لیے کھنچی چلی جا رہی ہے کہ قابل نظام کو وہ مجاہد میسر نہ آئے جو ناقص نظام کو حاصل ہوتے ہیں۔ یہی اثرات تھے جنھوں نے آخرکار ان کو افغانستان سے پھر ہندوستان کی طرف واپس بھیجا۔ یہاں یہ کئی سال تک احیائے ملت اسلامیہ کے لیے صدا بصحرا بلند کرتے رہے اور اس دھن میں انھوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اب یہ مایوسی کے مقام تک پہنچ چکے تھے کہ دارالاسلام کی دعوت ان کو پہنچی اور اس کو دیکھتے ہی ان کے ضمیر نے آواز دی کہ جس چیز کے لیے یہ برسوں سے سرگرداں تھے، وہ یہی ہے۔" [1]

لیکن احیائے ملت اسلامیہ کی جس تڑپ نے انھیں یہاں تک پہنچایا تھا اس کی تسکین کا یہاں کوئی سامان نہ تھا۔ وہ جس یوسفِ مقصود کی تلاش میں یہاں تک آئے تھے اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ یہاں رومان پسندوں کی ایک جماعت تھی یا بقول شورش کاشمیری ایک "کتابی تحریک" جس سے احیائے اسلام کی امیدیں وابستہ کرنا ہواؤں میں محل تعمیر کرنے کے مترادف تھا اور اب تو اس کے

---

[1] ماہنامہ ترجمان القرآن، مئی ۱۹۳۸ء

سامنے سے حکومت الٰہیہ کے قیام کا مقصد کبھی کا ہٹ چکا ہے۔ٔ
۶ر فروری ۱۹۷۱ء کی شب کو یہ یادگار شخصیت ہمیشہ کے لیے ہمارے

ٔ جماعت اسلامی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے سامنے ایک صالح نصب العین رکھتی ہے بلکہ صالح طریق کار کی بھی پابند ہے اس لیے اس کے امیر نے ۱۹۶۲ء میں کہا تھا کہ مسلم لیگ (کنونشن) کے پلیٹ فارم پر فرشتے بھی اُتر آئیں تو ان سے تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے ۱۹۶۴ء میں اسی مسلم لیگ کی قیادت کو قبول کیا اور مولانا مودودی صاحب جن کے نزدیک کوئی مسلمان اسلام کے دائرے میں رہتے ہوئے عورت کے سیاست میں حصہ لینے اور پارلیمنٹ کا ممبر بننے کا عقیدہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ انھوں نے مسلم لیگ، نیشنل عوامی پارٹی اور عوامی لیگ کے مشترکہ صدارتی امیدوار محترمہ فاطمہ جناح کی زور و شور اور عقیدت کے ساتھ تائید کی اور یہاں تک کہہ دیا کہ محترمہ فاطمہ جناح میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ عورت ہیں اور محمد ایوب خاں میں اس کے سوا کوئی خوبی نہیں کہ وہ مرد ہیں۔ پھر ۱۹۷۰ء میں دوبارہ متحدہ محاذ بنا تو اس میں بھی نہ صرف مسلم لیگ بلکہ نیپ اور عوامی لیگ بھی شامل تھیں اور معاہدے میں حکومت الٰہیہ کے قیام یا اسلامی آئین کے نفاذ کی شرط کے سوا سب کچھ تھا (چٹان لاہور مئی ۱۹۶۷ء) پھر ۱۹۷۲ء میں جب پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف محاذ بنایا گیا اور خالص سوشلزم کے والیوں کی رہنمائی میں جماعت اسلامی نے جو نیا سفر شروع کیا تھا وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ اب حکومت الٰہیہ کے اصلی مقصد اور نصب العین کے بجائے "جو مسلم ملکوں میں جمہوری طریقے ہیں ان کے مطابق آئین بنا دو" (فاران کراچی، اپریل ۱۹۷۲ء ص ۵) کی دعوت رہ گئی ہے۔

درمیان سے اُٹھ گئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے ان کا خاندان لاہور میں مقیم تھا۔ وہیں انھوں نے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ شورش کاشمیری نے ان کے انتقال پر جو کچھ لکھا تھا وہ ان کی شخصیت اور خدمات کے اعتراف کے لیے کافی ہے۔ شورش صاحب لکھتے ہیں:

"عزیز ہندی نہ صرف قربانی و استقامت کی ایک یادگار تھے بلکہ علم و نظر کے لحاظ سے بھی منفرد تھے۔ وہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان انقلابیوں کی ایک سچی تصویر تھے۔ ۶۰ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ لیکن ایک تہائی عمر نظربندی، قید اور جلاوطنی میں گزاری۔ مسلمان قوم انقلابی ہوتی تو بڑے اعزاز کے ساتھ دفن کیے جاتے لیکن انھیں اس طرح مٹی میں سُلا دیا گیا جس طرح کسی بیوہ کا آنسو مٹی میں تحلیل ہو جاتا ہے آخری پندرہ سال قید نے ان کے دل و دماغ کی تمام توانائیوں کو متاثر کیا۔ نتیجۃً وہ صرف ایک یادگار رہ گئے تھے۔ فی الجملہ اس یادگار کو بھی ہم نے اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔" [1]

ان کے علم و نظر اور انقلاب پسندی کی اس سے بڑی اور کیا دلیل ہوگی کہ وہ پانی کے دھوکے میں ایک سراب کی طرف دوڑے لیکن جلد ہی اس سراب کی حقیقت کو انھوں نے پا لیا۔ بلاشبہ وہ چند دن کے لیے

---

[1] ہفت روزہ چٹان، لاہور ۱۵ فروری ۱۹۷۱ء ص ۴

یک رومانی تحریک سے متاثر ہوئے لیکن ان کی بصیرت نے جلد ہی اندازہ کر لیا
کہ ان رومان پسندوں سے سیاسی انقلاب کی توقع عبث ہے اور وہ یہاں
ملکی محاذ قائم کرنے کے بجائے پھر اسی میدان کی طرف لوٹ گئے جو برٹش
استعمار کے خلاف سیاسی انقلاب کا اصلی و حقیقی میدان تھا اور جہاں فتح و
شکست کا آخری فیصلہ ہونے والا تھا۔ اللھم اغفرلہ

شیخ قمرالدین مرحوم

شیخ قمرالدین مرحوم لاہور کے مشہور تاجر و ناشر کتب اور مکتبۂ تعمیر انسانیت کے مالک تھے۔ ان کے والد حافظ تاج الدین مرحوم عالم دین بھی تھے۔ اکابر وعلمائے دیوبند سے انھیں بڑی عقیدت تھی۔ شیخ صاحب مرحوم بھی اسی مسلک کے پیرو تھے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے انھیں بڑی عقیدت تھی اور بڑی پابندی کے ساتھ حضرت علیہ الرحمہ کے درس قرآن حکیم میں شرکت فرماتے تھے۔

شیخ صاحب کی رسمی وروایتی تعلیم زیادہ نہیں تھی لیکن ان کی طبع سلیم اور اعمال صالح تھے۔ مولانا لاہوری علیہ الرحمہ کے درس قرآن حکیم نے ان کی طبع سلیم کو مجلیٰ کر دیا تھا، ان کے مزاج اور ذوق کو دین کے سانچے میں ڈھال دیا تھا اور دین کا شغف پیدا کر دیا تھا۔

شیخ صاحب مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت متاثر اور ان کے علم وفضل اور دینی، ملی اور ادبی خدمات کے معترف ومداح تھے

۱۹۲۰ء میں جب مولانا نے قیام نظم جماعت کی تحریک شروع کی اور مسلمانوں کو اس کی دعوت دی تو شیخ صاحب نے بھی اس دعوت

حق پر لبیک کہا اور مولانا کے دست حق پرست پر بیعت کرلی یہ سعادت انکفیں ۲۳ر اگست ۱۹۲۰ء بروز شنبہ کو لاہور کے مشہور بیرسٹر اور قومی کارکن میاں عبدالعزیز کے مکان پر حاصل ہوئی تھی۔

مولانا آزاد سے تعلق خاطر اور عقیدت وارادت نے شیخ صاحب مرحوم کی طبیعت میں بھی عزیمت و استقامت کی ایک شان پیدا کردی تھی۔ راقم السطور ان سے جون ۱۹۶۲ء میں ملا تھا۔ ان کی صحت اس وقت بھی اچھی نہیں تھی۔ آخری ڈیڑھ دو سال تو وہ مستقل طور پر بیمار رہے مرحوم نے بتایا تھا کہ ان کے نام مولانا کے متعدد خطوط تھے لیکن ضائع ہو گئے ایک خط محفوظ رہ گیا تھا اور ازراہ محبت انھوں نے اس کی نقل کی اجازت دیدی تھی۔ یہ خط مولانا کے زیر ترتیب مجموعہ میں شامل ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اگرچہ ان کا گرد وپیش بالکل بدل گیا تھا کچھ کاروباری مجبوریاں بھی تھیں لیکن مولانا آزاد کے علم وفضل، اخلاق وسیرت اور خدمات دینی وعلمی کے جو نقوش ان لوح وقلب و دماغ پر ثبت تھے وہ مٹ نہیں سکے۔

۴ر اپریل ۱۹۶۸ء کو شیخ صاحب نے لاہور میں پیام اجل کو لبیک کہا اور رحلت فرماتے عالم جاودانی ہوئے۔ شیخ صاحب بڑے نیک، شریف النفس، سلیم الطبع، منکسر المزاج اور متقی پرہیزگار بزرگ تھے[1]

[1] اس مضمون کی تیاری میں حکیم احمد سعید سلیمانی صاحب کا مضمون ماہنامہ تفہیم القرآن مطبوعہ ہفت روزہ آئین لاہور بھی پیش نظر رہا ہے

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

برصغیر کے مشہور ادیب، صحافی اور بلند پایہ شاعر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم بھی مولانا آزاد کے مریدہیں۔ صوفی صاحب ۱۸۹۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے ان کا تعلق ایک کشمیری خاندان سے ہے جو ایک مدت سے کاروبار کے سلسلے میں امرتسر میں سکونت پذیر تھا۔ ابتدار سے اعلیٰ ثانوی درجات تک تعلیم امرتسر میں حاصل کی۔ آنرز کا امتحان ایف۔سی کالج، لاہور سے پاس کیا۔ والد غلام رسول مرحوم کا اصرار تھا کہ کاروبار شروع کیا جائے لیکن تعلیم کے شوق نے انھیں اسلامیہ کالج میں داخل کروادیا چنانچہ پنجاب یونی ورسٹی سے آپ نے ایم اے فارسی کا امتحان پاس کیا پھر ٹرسنگ کالج سے بی ٹی کی تکمیل کی۔

ملازمت کی ابتداء گورنمنٹ کالج امرت سر سے ہوئی۔ جہاں آپ پہلے سینیر ٹیچر مقرر ہوتے کچھ عرصے بعد انسپکٹر آف اسکول کی حیثیت سے منتخب کرلیے گئے لیکن جلد ہی اس ملازمت کو چھوڑ کر لاہور آگئے اور گورنمنٹ ٹریننگ کالج میں استاد مقرر ہوتے۔ چار سال کے بعد گورنمنٹ کالج میں لیکچرز مقرر ہوتے اور پچیس سال تک اسی کالج سے

وابستہ رہے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد حکومت ایران نے انھیں خانۂ فرہنگ ایران کا ڈائرکٹر مقرر کیا۔

صوفی صاحب کی ادبی اور صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۲۴ء میں نیرنگ خیال، لاہور کے اجرا کے ساتھ ہوا۔ صوفی صاحب نے اس میں لکھا بھی اور ڈاکٹر تاثیر اور حفیظ جالندھری کے ساتھ اس کی ادارتی ذمہ داریوں میں بھی شریک رہے۔ مخزن جب دوبارہ نکالا گیا تو اس کے مدیر اعزازی صوفی صاحب تھے اور جب ۱۹۶۲ء میں ہفت روزہ لیل و نہار لاہور سے جاری ہوا تو آپ اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ لیل و نہار بند ہونے کے بعد ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہوئے اور اب تک اسی سے وابستہ ہیں۔

صوفی صاحب نے اخبارات و رسائل میں بہت لکھا۔ اپنے نام سے بھی اور ملازمت کی مجبوری سے وجہ سے شہباز کاشمیری اور عرفان کاشمیری کے قلمی ناموں سے ملی مفاد کے موضوعات اور سیاسی، تعلیمی، سماجی مسائل پر سینکڑوں مضامین لکھے ہیں،

صوفی صاحب کے متعدد زبانوں پر عبور حاصل ہے پنجابی اور اردو تو انھوں نے ماں کی گود میں ابتدائی تعلیمی و تفریحی ماحول میں سیکھیں اور اس طرح دونوں گویا ان کی مادری زبانیں ہیں۔ انگریزی کا بلند پایہ ادبی ذوق رکھتے ہیں اور تحریر و تقریر پر انھیں قدرت حاصل ہے عربی سے بھی واقف ہیں لیکن فارسی زبان و ادب پر ان کا عبور اور شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق اہل زبان کے لیے بھی باعث رشک ہے صوفی صاحب فارسی کے بلند پایہ اور صاحب طرز ادیب ہیں۔

اعلیٰ ذوق اہل زبان کے لیے بھی باعث رشک ہے۔ صوفی صاحب فارسی کے بلند پایہ اور صاحب طرز ادیب ہیں۔

صوفی صاحب پنجابی اور اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ اردو میں بچوں کے لیے انھوں نے خاص طور پر بہت سی نظمیں لکھیں جو نہایت کامیاب اور مقبول ہیں۔ فن مصوری میں بھی علمی اور عملی طور پر دخل ہے۔ موسیقی کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ حکومت پاکستان نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں "ستارۂ خدمت" کا اعزاز دیا ہے۔ اور حکومت ایران نے ان کے علم و فضل کے اعتراف میں انھیں "نشان فضیلت" کا اعزاز بخشا ہے۔

صوفی صاحب متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں "جھولنے" بچوں کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ انھیں ان کے پتاجی، اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ حکمت قرآن، ان کی بلند پایہ تصنیف ہے۔ ایک کتاب کا موضوع علامہ اقبال کی شخصیت و کلام ہے بہت سے انگریزی ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا ہے جو پنجابی اور اردو میں کئی مجموعوں میں چھپ گئے ہیں۔

صوفی صاحب نے عملی سیاست میں حصہ لیا لیکن نظری طور پر وہ ہندوستان کی مسلم سیاست اور مسلم تحریکات ان کے غور و فکر ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ حکمت قرآن ان کے اسی مطالعے اور غور و فکر کا حاصل ہے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی و عمرانی نظریات اور فلسفے سے

وہ خاص طور پر متاثر ہیں۔ مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے انھیں خاص عقیدت ہے۔

۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد، رانچی کی نظر بندی سے رہائی کے بعد جب کہ تحریک خلافت اور تحریک ہجرت شباب پر تھی امرتسر پہنچے اور ایک نہایت پرجوش تقریر کی۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں کی شورا شوری ختم ہو چکی تھی، مولانا آزاد کی اس تقریر نے لوگوں میں ایک جوش اور ہیجان پیدا کر دیا۔ مسلمان خاص طور پر اس سے متاثر ہوئے اس میں بھی نوجوان طبقہ تھا جس نے مولانا کے افکار میں ایک ولولۂ تازہ پایا۔ مولانا نصراللہ خاں عزیز نے غالباً مولانا کی اس موقعے کی تقریر کے متعلق لکھا ہے:۔

"امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں شام کے وقت مولانا تقریر کر رہے تھے مجھے وجدان ہی نہیں آنکھوں سے اس طرح محسوس ہو رہا تھا گویا تقریر ایک نور کی چادر کی طرح تمام مجمع پر چھائی ہوئی ہے۔ یکایک قریب کی ایک مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی، خطیب تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ میں نے اس طرح محسوس کیا گویا کسی نے چادر کو چاک کر کے مجمع کے سروں پر سے کھینچ لیا ہے میں نے ہندوستان کے تمام مشہور و معروف مقرروں کی تقریریں سنی ہیں مگر یہ عجیب و غریب کیفیت کبھی محسوس نہیں کی۔"

صوفی صاحب اس زمانے میں تھرڈ ایر کے طالب علم تھے۔ مولانا کی تقریر سے متاثر ہوئے، دوسرے روز ان سے ملنے پہنچ گئے۔ مولانا کے پاس وقت کم اور ملاقات کے متمنی زیادہ لوگ تھے۔ پانچ منٹ سے زیادہ وقت مولانا کسی کو نہیں دے رہے تھے۔ صوفی صاحب تفصیلی ملاقات کے طالب تھے اور کچھ شکوک و شبہات رفع کرنا چاہتے تھے اس لیے دوسرے روز صبح، فجر سے پہلے کا وقت ملاقات کے لیے طے ہوا۔ صوفی صاحب وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ وہ سوال کرتے اور مولانا جواب دیتے رہے۔ نمازِ فجر تک تمام شکوک و شبہات دُور ہو چکے تھے۔ مولانا کے ساتھ نماز ادا کی اور مولانا کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ؎

مولانا آزاد سے ان کے تعلقات صرف مرشد و مسترشد کے نہ تھے علمی بھی تھے۔ مولانا جب کبھی لاہور تشریف لاتے تو صوفی صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوتے لیکن عام طور پر ان کی ملاقات کا وقت وہی ہوتا جو ان کی پہلی ملاقات کا ہوتا تھا۔ یعنی صبح سویرے، نماز فجر سے قبل۔ کبھی اکیلے ہوتے کبھی کوئی دوست مثلاً سالک صاحب ساتھ ہوتے۔

صوفی صاحب مولانا کے فضل و کمال، ان کے تبحر علمی، ان کے کمال حافظہ، ان کی ذہانت، وسیع النظری، ان کی وضع داری اور ان کے محاسن اخلاق و سیرت کے معترف و مدح ہیں۔

جب یہ نوٹ لکھا گیا تو صوفی صاحب بقید حیات تھے۔ لیکن کئی سال کی تاخیر کے بعد جب یہ کتاب پریس کے حوالے کی جا رہی ہے وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ ۲ فروری ۱۹۷۶ء کو لاہور ریلوے اسٹیشن پر حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہوا

مولوی محمد منیر الزماںؒ

مولوی منیر الزماں چاٹگام کے رہنے والے تھے۔ چاٹگام کا قدیم نام اسلام آباد تھا، اسی نسبت سے وہ اسلام آبادی مشہور تھے۔ خلافت کمیٹی، جمعیتہ العلمائے ہند، تحریک ہجرت، تحریک لاتعاون وغیرہ کے وہ سرگرم کارکن تھے۔ ان کے خطوط[1] کے مطالعے سے ان کی ہمہ وقت سیاسی مصروفیت اور دینی و علمی کاموں میں ان کے انہماک کا پتا چلتا ہے۔

سیاسی و ملی تحریکات اور جماعتوں کے کام کے سلسلے میں انھوں نے اپنے صوبے اور صوبے سے باہر یوپی، بمبئی اور بہار وغیرہ میں بھی عظیم الشان خدمات انجام دیں خصوصاً چاٹگام ڈھاکہ وغیرہ میں اِن کی وجہ سے ہمیشہ سیاسی سرگرمی رہی انھوں نے جمیعتہ کی شاخوں کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد کی تبلیغ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

وہ کچھ دنوں تک علمائے بنگال کے ترجمان اخبار سلطان کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ سودیشی خلافت اسٹور کی ذمہ داریاں بھی اِن کے

---

[1] نقوش، لاہور، خطوط نمبر (جلد دوم)، ص ۲۰۱۔ ۱۹۶

کاندھوں پر تھیں۔ وہ ایک جامعہ عربیہ کے قیام کے لیے بھی کوشاں رہتے۔ سیاسی اور قومی خدمت میں انھیں بڑا انہماک تھا۔ اپنی آبائی جائیداد قوم کے عشق میں لٹا چکے تھے لیکن قومی خدمت کا جذبہ انھیں چین نہ لینے دیتا تھا۔ ان کی غیرت ان کو کسی کے سامنے ہاتھ بھی نہ پھیلانے دیتی تھی اور اس وجہ سے وہ کافی مالی مشکلات میں مبتلا اور مقروض رہتے تھے۔

مولوی منیرالزماں صاحب نہایت مخلص، بے ریا، بے نفس، نام و نمود سے بے نیاز، ذاتی مفاد سے قطعاً گریزاں تھے۔ حق گوئی ان کا خاص شیوہ تھا اور اس معاملے میں وہ کسی کی رو رعایت نہ کرتے تھے مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے ان کے بہت قریبی روابط تھے اور وہ مولانا کا بہت احترام کرتے تھے۔ لیکن دینی و سیاسی مسائل میں وہ ان سے کھل کر اختلاف کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں علمی و عملی صلاحیتوں سے نوازا تھا تحریر و تقریر میں انھیں کافی مہارت تھی، وہ بہترین تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اسلامی علوم و فنون کا مطالعہ ان کا کافی وسیع تھا اور وقت کے مسائل کی اہمیت کا اندازہ لگا لینے کی ان میں خاص خوبی تھی۔ مسئلہ ہجرت اور تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں عدالتوں میں اپنے دفاع سے دستبرداری کی پالیسی سے اِن کا اختلاف اِن کی سیاسی و دینی بصیرت پر شاہد عدل ہے ۱۹۳۰ء کے اواخر یا ۱۹۳۱ء کے اوائل میں جب مولانا عبدالباریؒ کے معتقدین نے امارت شرعیہ فی الہند کی مسند نشینی کے امیدوار کی حیثیت

سے انھیں کبھی میدان میں لانا چاہا اور انھوں نے مولوی منیر الزماں صاحب کی رائے دریافت کی تو انھوں نے مولانا فرنگی محلی سے اپنے ذاتی روابط اور تعلقات کے باوجود حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح کے قبول عہدہ سے انکار کی صورت میں اپنی رائے مولانا ابوالکلام آزاد کے حق میں دیدی۔[۱]

مولوی منیر الزماں صاحب صرف علی اللسان ہی نہیں تھے بلکہ صاحب علم وفضل بھی تھے۔ وقت کے تمام اکابر، علمائے دین اور اصحاب سیاست سے ان کے تعلقات تھے۔ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا محمد سجاد بہاری، مولانا اکرم خاں صاحب، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی وغیرہم سے دوستانہ تعلقات تھے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بہت قریبی روابط تھے اور حضرت شیخ الہند سے انھیں بڑی عقیدت تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے خصوصی روابط تھے۔ وہ مولانا کے علم وفضل سے بہت متاثر تھے اور عقیدت رکھتے تھے۔ بنگال میں وہ مولانا آزاد کی تحریک نظم جماعت کے سرگرم کارکن تھے۔

مولوی منیر الزماں مرحوم کے سنِ پیدائش یا تاریخ وفات کا پتا نہیں چل سکا۔ جون ۱۹۲۴ء میں انھوں نے اپنی "تیس سالہ عملی زندگی" کا تذکرہ کیا ہے۔ اس لیے اگر انھوں نے بیس سال کی عمر میں عملی زندگی میں قدم رکھا ہو تو ۱۸۷۴ء کے لگ بھگ ان کی پیدائش ہونی چاہیے۔ مولانا فرنگی محلی کے نام خطوط کے انداز بیان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیان میں پختہ عمر کے شخص تھے۔

---

[۱] نقوش، لاہور، خطوط نمبر (جلد دوم) ص ۱۹۸۔

مولوی شفاعت علی

مولوی شفاعت علی، علوی بکڈپو (نظیر آباد لکھنؤ) کے مالک اور ظفر الملک مولوی اسحاق ایڈیٹر "الناظر" (لکھنؤ) کے بڑے بھائی تھے۔ بڑے جری اور بڑے حق گو تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے ہاتھ پر انھوں نے بیعت کی تھی۔ بیعت سے پہلے کا ملیح آبادی نے ان کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ قیصر باغ کی بارہ دری میں مولانا آزاد تقریر کر رہے تھے اچانک مولانا ایک بات پر اٹک گئے اور ایک ہی بات کو بار بار دہرانے لگے اس پر انھی مولوی شفاعت علی نے چلا کر کہا تھا "ایک ہی بات کب تک رٹی جائے گی اڑیل ٹٹو کو آگے بڑھاؤ" بعد میں یہ مولانا کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ گویا عقیدت نہیں عشق ہو گیا تھا۔ ان کا ایک واقعہ مولانا آزاد کی زبانی بھی سن لیجئے۔ مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں:-

"ایک مرتبہ مولانا (آزاد) سے اس مذکورہ بالا واقعے کا تذکرہ ہوا، تو ہنس کر کہنے لگے، انھی حضرت نے اسی قیصر باغ کی بارہ دری میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کو بھی تقریر میں ٹوکا تھا۔ ڈپٹی صاحب بہت بڑے مقرر ہی نہ تھے، بہت بڑے پھکڑ

بھی تھے۔ اپنی تقریر میں لکھنؤ والوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔
شفاعت علی بگڑ گئے اور چلا اُٹھے، باہر نکلو گے تو مزہ چکھا
دُوں گا!' اس وقت شفاعت علی نوجوان تھے اور مرحوم ڈپٹی
صاحب رنگین مزاج" میاں صاحبزادے" کہہ کر فرمانا شروع
کیا' اخاہ! آپ ہیں، بڑے چکنے چکنے گال ہیں! خاص لکھنؤ کا
تحفہ ہے۔ بھلا اکھڑ دہلی میں ایسا چوزہ کہاں نصیب! میاں
ذرا قریب تو آؤ، ایک ہی چٹخارہ....... آخر شفاعت علی
صاحب ساری شیخی بھول گئے۔"

مولانا ملیح آبادی نے "ذکر آزاد" میں (ص ۴۳-۲۸) ان کا دلچسپ
تذکرہ کیا ہے۔ مدت ہوئی ان کا انتقال ہو گیا۔

سردار محمد خاں

بیعت کرنے والوں میں ایک صاحب ملیح آباد کے رہنے والے اور
مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے رشتہ دار سردار محمد خاں بھی تھے۔
مولانا آزاد کو یہ صاحب بہت پسند تھے۔ بڑے کھلے کھلے کے آدمی
تھے۔ اولوالعزم اور جری تھے اور طاقت ور بھی۔ پنجہ کش تو ایسے کہ ہندوستان
بھر میں ان کی ٹکر کا پنجہ کش کوئی نہ تھا۔ مدتوں اخباروں میں پانچ سو روپے
انعام کے ساتھ چیلنج نکلتا رہا مگر کبھی کوئی آدمی ان سے پیش نہ جا سکا۔

مولانا آزاد سے انھیں بڑی عقیدت تھی، مولانا بھی انھیں بہت پسند کرتے تھے۔ جب ملیح آبادی نے انھیں ان کے انتقال کی خبر سنائی تو مولانا نے بہت افسوس کیا اور کہا "بہادر اور اولوالعزم آدمی تھا۔" [۱]

منّے خاں

مولانا ملیح آبادی کے ہاتھ پر جن اصحاب نے بیعت کی ان میں تیسرے صاحب جن کا نام معلوم ہو سکا ہے منّے خاں تھے۔ ان کا تذکرہ مولانا ریاست علی ندوی نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"مولوی گنج اور گولا گنج کے کچھ جوشیلے مسلمانوں نے بھی بیعت کی جن میں منّے خاں صاحب بھی تھے۔ منّے خاں صاحب جو آگے چل کر خاکسار یا احرار تحریک کے لکھنؤ میں لیڈر بھی تھے۔ مولانا ملیح آبادی کے گہرے معتقدین میں سے تھے اور ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔" [۲]

---

[۱] ذکر آزاد، صفحہ ۳۰۔

[۲] آزاد ہند، کلکتہ ملیح آبادی نمبر صفحہ ۱۸۔

محمد یونس خالدی

مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں محمد یونس خالدی صاحب آخری شخص ہیں جنھیں یہ سعادت حاصل ہوئی۔ ان کو بچپن ہی سے مولانا سے بڑی عقیدت ہے۔ مولانا ان کے ممدوح اور مرکز عقیدت بھی ہیں اور علمی موضوع بھی۔ مولانا کی شخصیت اور افکار کا انھوں نے بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے مولانا کے دینی و سیاسی افکار سے اپنی فکر کا چراغ روشن کیا ہے اور عملی زندگی میں مولانا کی عزیمت و استقامت کو مشعل راہ بنایا ہے۔

محمد یونس خالدی صاحب ۲۳ر اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بارہ بنکی (یو۔پی) میں پیدا ہوئے ان کا آبائی وطن لکھنؤ ہے۔

زمانۂ طالب علمی سے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اس کے نتیجے میں سنت یوسفی تو ضرور ادا کر لی۔ لیکن درسی تعلیم کی تکمیل نہیں ہو سکی البتہ مطالعے کے شوق نے انھیں روایتی تعلیم کے حاصل سے محروم نہیں رکھا۔

خالدی صاحب شگفتہ نگار ادیب اور بالغ نظر نقاد بھی ہیں۔ "مطالعۂ میر سید علی غمگیں" کے نام سے ان کی ایک ادبی، تنقیدی اور تحقیقی کاوش (انجمن ترقی اردو ہند) علی گڑھ سے شائع ہو کر مقبول ہو چکی

ہے۔ "روح آزاد" کے نام سے مولانا آزاد کی شخصیت اور فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے مولانا آزاد پر بہت سے بلند پایہ مضامین لکھے ہیں جو اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور بھی کئی علمی و ادبی شخصیات اور دیگر موضوعات پر انھوں نے اپنے نتائج مطالعہ و تحقیق اور افکار کو مرتب کیا ہے۔ ایک مدت تک انجمن ترقی اردو (ھند) علی گڑھ سے وابستہ رہے، کچھ دنوں قومی آواز لکھنؤ کے ادارے سے وابستہ رہے اور بھی کئی اداروں اور اشخاص کے تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں معاون رہے ہیں۔

خالدی صاحب نہایت شریف، متواضع، خلیق، راسخ العقیدہ، نیک نفس اور حسن سیرت و عمل کے مالک ہیں۔

باب ہشتم

استدراک

صوبہ سرحد

تحریک نظمِ جماعت[1] کے سلسلے میں مولانا آزاد نے جو کوششیں کی تھیں وہ یوپی، پنجاب اور سندھ تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ صوبہ سرحد میں بھی ان کوششوں کے نشان پائے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جو حالات اب تک سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ صوبہ سرحد میں مولانا ابوالکلام آزاد کی حزب اللہ نہایت منظم اور مستحکم بنیادوں پر قائم تھی۔ حزب اللہ کا قیام مدرسہ فتح پوری دہلی کے صدر مدرس اور حضرت شیخ الہند کی تحریک کے ایک خاص رکن اور مولانا ابوالکلام آزاد کے معتمد خاص مولانا سیف الرحمٰن کی کوششوں سے عمل میں آیا تھا۔ محمد اسلم سجزی نے انھیں حزب اللہ کا موسس لکھا ہے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی اس کے صدر اور قاضی گل احمد سجزی اس کے معتمد تھے۔

تحریک حزب اللہ کے تحت پشاور میں بڑا کام ہوا۔ لوگوں میں اس کا اثر تھا۔ مسلمانوں کی اصلاح کا کام اس کے تحت کیا گیا۔ مدارس کا قیام عمل میں

---

[1] اس مضمون کی تیاری میں حکیم محمد اسلم صاحب سجزی کی خود نوشت اور راقم کے نام ان کے خطوط سے مدد لی گئی ہے۔

آیا۔ صوبہ سرحد میں تحریکِ جہاد اور پھر تحریکِ ہجرت کو اسی کے کارکنوں نے منظم کیا
جون یا جولائی ۱۹۱۵ء میں حزب اللہ کا ایک خفیہ اجلاس حاجی صاحب
ترنگ زئی کے گاؤں میں ہوا جس میں حزب اللہ کے بہت سے اراکین
شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں آزاد قبائل کی صورتِ حال پر غور کرنے کے
بعد میدانِ جہاد میں کود پڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ محمد اسلم سنجری صاحب لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے طول و عرض میں آگ لگی ہوئی تھی۔ مولانا ابوالکلام
آزاد، حسین احمد مدنی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں،
مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ آل انڈیا کانگریس کے ممتاز زعماء
بھی انگریزوں کی مخالفت تحریر و تقریر میں کر رہے تھے۔
وہ واضح الفاظ میں جنگِ عظیم اوّل کو جنگِ زرگری
گردانتے ہوئے ہندوستان کے جوانوں کی فوج میں بھرتی
کی مخالفت میں آواز بلند کر رہے تھے..... صوبہ سرحد کی صورت
حال نہایت نازک ہو چکی تھی۔ قبائلی علاقوں میں ترکوں کی حمایت
میں شورشوں کا آغاز نومبر ۱۹۱۴ء میں ہو چکا تھا۔ حزب اللہ
کی پشاور شاخ کے اراکین اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا خواب دیکھ
رہے تھے۔ انھوں نے آزاد قبائل میں جہاد کی نفیر پھونکی چنانچہ
مارچ ۱۹۱۵ء میں ٹوچی و کرم میں انگریزوں کے خلاف شورشوں
کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۷ اپریل کو چکنا در ملا نے برطانوی علاقے
پر حملہ کرکے اللہ بخش میل کا علاقہ فتح کر لیا اور چار ہزار قبائلی مجاہدین کو۔

لے کر ضلع پشاور کے علاقہ شب قدر پر حملہ آور ہوا۔ میجر جنرل ینگ نے مدافعت کی اور قبائلی مجاہدین کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اسی سال جون میں ملا صاحب باڑہ مجاہدین کی رہنمائی کے لیے میدانِ جنگ میں اُترے اور انھوں نے مامونہ و مہمند قبائل کو اس جہاد کے لیے مستعد کیا۔ یہ واقعات ایسے نقطۂ عروج کو پہنچ چکے تھے جس کا لازمہ تھا کہ پشاور کے حزب اللہ کے اراکین اب میدانِ کارزار میں اتر آئیں۔ چنانچہ حاجی صاحب ترنگ زئی کے گاؤں میں اُنھی کی خانقاہ میں قابل اعتماد ارکان حزب اللہ کی ایک نشست ہُوئی۔ حاجی صاحب ترنگزئی کے علاوہ مولانا سیف الرحمٰن، قاری عبدالمستعان، مولانا تاج محمد، مولانا عبدالعزیز، مولانا مخفی، مولانا فضل ربی دیوبندی اور دیگر عمائدین شریک ہُوئے۔ اس جلسے میں مَیں بھی شریک تھا۔ تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد جہاد کا فیصلہ کر لیا گیا اور یہ طے پایا کہ حزب اللہ کے اراکین بمع مجاہدین، بنیر کے محاذ پر پہنچیں اور وہاں سے انگریزی علاقے خصوصاً مردان پر قبضہ کر لیا جائے۔"

اس اقتباس سے حزب اللہ کی اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ اس کے اہم ارکان کا علم بھی ہو جاتا ہے۔

پشاور کے علاوہ مردان اور نوشہرہ میں بھی حزب اللہ کی شاخیں قائم تھیں

جہاد میں شرکت کے فیصلے کے بعد جب ملک کے جانبازوں اور تحریک جہاد و آزادیٔ ملک کے مجاہدین کا یہ قافلہ روانہ ہُوا تو مردان اور نوشہرہ کے کارکنانِ حزب اللہ کو بھی ان کے فرائض دینی و ملّی کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اسلم سبحزی صاحب لکھتے ہیں:

"مردان میں حزب اللہ کے اراکین سے ملے اور صورتِ حال سے انھیں آگاہ کیا۔ جہاد کے لیے لوگوں کے دل و دماغ کی تربیت بہت پہلے کی جا چکی تھی۔ چنانچہ جہاد کی دعوت پر ہر ایک نے لبیک کہا اور چالیس افراد کا ایک جتھا فوری طور پر ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ پشاور سے آتے ہُوئے چند گھنٹے کے لیے نوشہرہ اُتر کر جہاد کے متعلق پوسٹر تقسیم کرنے کے لیے حزب اللہ کے مقامی قابل اعتماد کارکنوں کو دے دیے اور انھیں ہدایت کر دی کہ رضاکاروں اور مجاہدوں کو چھوٹے چھوٹے جتھوں میں محاذ نیلم پر روانہ کرنے کی کوششیں جاری رکھیں اور یہ تمام سرگرمیاں نہایت راز میں رکھی جائیں چنانچہ ہم لوگوں کے مردان پہنچنے کے بعد ہی نوشہرہ کے اطراف و اکناف سے مجاہدین ہدایت کے مطابق چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں آنے لگے۔ قاری عبدالمستعان کے گاؤں اکبر پورہ و کنڈر سے سو مجاہدین مختلف ٹولیوں میں محاذ نیلم کے لیے عازم ہوئے۔ اسی طرح تاروجبہ، پبی، پسر پیادی، ٹیٹارو وغیرہ سے بھی مجاہدین

جوق در جوق محاذ بنیر کو روانہ ہوئے ۔ یہ اطلاعات ہمیں سرحدان میں ملیں اور نہایت ہی خوش آیند طمانیت قلب کا باعث ہیں۔"

جب جنگ کے دوران میں انگریزوں نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی کی اور مجاہدین کے پاس ایک وفد بھیجا تو اس وفد سے گفتگو کے مجاز رئیس حزب اللہ حاجی صاحب ترنگزئی قرار دیے گئے اور خواتین و امیر المجاہدین نعمت اللہ کے علاوہ حزب اللہ کے چند ارکان بھی اس گفتگو میں شریک تھے ۔ اس سے حزب اللہ کے ارکان کے سیاسی اثر و رسوخ کا پتا چلتا ہے ۔

پشاور میں سر جارج روس کیپل نے سر صاحبزادہ عبدالقیوم اور دوسرے انگریز حاشیہ برداروں کی مدد سے اسلامیہ کالج قائم کیا تو "حزب اللہ نے فوراً اس کے بالمقابل اسلامی دار العلوم کے لیے زمین خریدی اور دیگر اسکول کھولے جس کی پاداش میں حزب اللہ کو اتنا پیسا گیا کہ جہاد بنیر جو بہت ہی قبل از وقت ہم نے شروع کیا ان اضطرابات واقع کا ایک اضطراری پہلو تھا۔" محمد اسلم مجزی کی اس خود نوشت کے ایک ذیلی نوٹ سے بھی حزب اللہ کے اثرات اور اس کی خدمات دینی و ملی پر روشنی پڑتی ہے، لکھتے ہیں :

"اگرچہ افغانوں کے گھر دشمنی صدیوں تک جاری رہتی ہے اور اگر کبھی دشمن کو محراب مسجد میں بھی پالیں تو قتل کر دیتے ہیں مگر جنگ بنیر اور ما بعد جنگ مہمند و وزیرستان میں جو حزب اللہ کے زیر اثر لڑی گئیں، ایسا کوئی بھی واقعہ رونما نہیں ہوا ۔ یہ حزب اللہ کے بہت ہی بڑے ڈسپلن کا نتیجہ اور حزب اللہ کے عظیم اثر اور

تبلیغ و تنظیم کا اثر تھا۔"

محمد اسلم سجزی کی خود نوشت سے حزب اللہ کے متعدد کارکنوں کا پتا چلتا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی پچھلے صفحوں میں گزر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اہم کارکن مفتی صالح محمد مرحوم تھے۔ ایک موقع پر لکھتے ہیں: "میرا دوست مفتی صالح محمد مرحوم حزب اللہ کا زبردست کارکن تھا۔" ایک رکن حاجی صاحب ترنگزئی کے منتسبین میں سے تھے۔

کئی قاصدوں کا پتا بھی چلتا ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے معتمد علیہ تھے ان کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ وہ مولانا آزاد کی تحریک جہاد اور حزب اللہ سے متعلق تھے کہ نہیں۔ مولانا آزاد نے ان پر جو اعتماد کیا اسے انھوں نے خوب نبھایا۔ یہ ان کی اعلیٰ سیرت کی بہت بڑی دلیل ہے اور مولانا آزاد اور ان کی تحریک سے دلی وابستگی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ ان معتبر قاصدوں میں ایک قاصد بخشا تھے جن کا ذکر اسلم صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"پندرہ دن بعد جب نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر میں مطب جا رہا تھا کہ حاجی صاحب کا قاصد مخصوص اشارات کا حامل راستے میں ملا۔ جب مطب پہنچا تو ایک لنگوٹ بندھا ہوا پنجابی بیٹھا ہوا ملا۔ سخت احتیاط کرنا اب معمول ہو گیا تھا۔ اجنبی سے علیک سلیک ہوئی، اس نے مصافحے ہی میں مرموزِ علامت کف دست پر بنائی۔ بالاخانے پر جس کا راستہ دکان کے اندر ہی سے تھا جانے کا میں نے اسے اشارہ کیا۔ میں نے دو مریضوں کو نسخہ دیا۔ میرے

وفادار کمپوڈر شہباز نے اشارے سے سمجھا دیا کہ اوپر ایک دوسرا آدمی بھی میرا منتظر ہے۔ میں ذرا گھبرایا اور فوراً بالاخانے پر پہنچا تو دیکھا کہ کوئی آدمی چارپائی پر چادر تانے لیٹا ہے اور پنجابی نو وارد بازار کی طرف کرسیوں پر تکیہ لگائے بیٹھا ہے اب لفوائے آنکہ چھپا رستم خطرناک ہونا ہے۔ پنجابی بھائی کو اشارے سے میں نے اُوپر چھت پر جانے کو کہا۔ اس کے اوپر چلے جانے کے بعد میں نے ردا پوشیدہ کو جگایا کہ بھائی آپ کون ہیں؟ اس نے مُنہ کھولا تو جھٹ میں نے پہچانا کہ حاجی صاحب کا خاص قاصد اور ترنگ زئی کے میاں گھرانے کا چشم و چراغ اور رکن حزب اللہ ہے۔ میں نے جلدی جلدی سوالات کیے اور اس نے مایوسی سے ہر ایک کا جواب دیا اور بتایا کہ بنیر والوں کا معاہدہ مکمل ہو گیا اور حزب اللہ رخت سفر باندھ رہی ہے اور سلسلہ تعلق و ترسیل زر و سامان تا حکم ثانی بند رہے۔ یہ کہہ کر میاں صاحب فوراً جانے لگے اور کہہ گئے کہ ملا دور بین وغیرہ کو واپس بھیجیں اور پھر جلد ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

اب دُوسرے صاحب کو آواز دی، وُہ تشریف لائے اور مولانا عبدالقادر قصوری کا خط جو مولانا ابوالکلام آزاد کی مرموز ہدایات کا ایک باریک کاغذ پر لکھا ہوا تھا، دیا اور زبانی کہا

"کہ آپ کی عدم موجودگی میں بھوپال کی رقم مجاہدین چمرکنڈ کے وسیلے بھیج چکے ہیں۔ میں نے رقم کی تفصیل معلوم کرنے کی ضرورت نہ سمجھی مگر مزید امداد کو حسب الامر رئیس حزب اللہ منع کر دیا۔ مہمان کی چائے پانی سے تواضع کی۔ خط لے کر سنبھال لیا اور ان کو مشورہ دیا کہ حجرہ مسجد مہابت خاں میں شب باشی کریں۔ ان کا فرضی نام بخشا تھا۔ وہ چلے گئے۔"

ایک اور قاصد جن کا ذکر اسلم صاحب نے کیا ہے ڈاکٹر صدر الدین تھے۔ اسلم صاحب لکھتے ہیں :

"انہی ایام میں مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف سے دھڑا دھڑ چندے، ادویات کے بکس اور ایک ڈاکٹر جن کا اصطلاحی نام ڈاکٹر صدر الدین تھا اور اصلی نام ڈاکٹر عبدالکریم تھا اور چیت سنگھ بنارس کے رہنے والے تھے، پہنچنے شروع ہوئے یہ سامان ہاتھوں ہاتھ پُراسرار طریقوں سے غازی آباد، مہمند، چمرقند، جلال آباد و باغ شاہی اور قمبر خیلوں میں پہنچایا جانے لگا۔ پھر بھی واپسی کے وقت قاصد یہی فریاد لاتے تھے کہ دس ہزار کا سونا کم ہے، فلاں رقم میں پچاس ہزار کارتوس بھی نہ خریدے گئے بندوقوں کے لیے پانچ لاکھ روپے کی اور ضرورت ہے۔ میں ان پیغامات کو سربمہر عجیب و غریب ایلچیوں کے ذریعے جو اکثر مولانا ابوالکلام آزاد کے مرید یا مولانا عبدالقادر قصوری کے

مخلص ہوا کرتے تھے، بھیج دیا کرتا تھا۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ تمام کوششیں تحریک نظم جماعت یا تحریک جہاد کے سلسلے کی تھیں، اس لیے ان کا تذکرہ ضروری تھا۔ اس تحریک کے کئی کارکن اور مولانا کے مرید برٹش استعمار کے جال میں پھنس گئے اور دنیا کا لالچ ملت کے عشق پر غالب آگیا اور بجائے اس کے کہ وہ اپنی سیرت اور عمل کا کوئی پہلو اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ چھوڑ جاتے اس تحریک کی رسوائی اور ناکامی کا سبب بن گئے۔ محمد اسلم سجزی نے اپنی خود نوشت میں اور راقم کے نام خطوط میں چند ایسے لوگوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ ان میں سے ایک شخص گل باز خاں نامی تھا جو جنگ بنیر میں ان کا شریک تھا لیکن فی الحقیقت وہ سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔ جنگ سے واپسی کے بعد یہ شخص محمد اسلم، ان کے بھائیوں اور ان کے والد کے لیے نیز دوسرے مجاہدین کے لیے سخت ترین آزمائشوں کا باعث بنا اور اس ملت فروشی کے صلے میں معمولی سی ترقی حاصل کی۔ محمد اسلم صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مولانا آزاد کے مریدین کچھ فوت ہو گئے اور ایک دو سی آئی ڈی کے بڑے افسر بن گئے۔ ان میں سے ایک زندہ ہے، مگر کہاں ہے یہ پتا نہیں۔ اس نے مولانا آزاد کے ساتھ اپنی کوئی فرضی تصویر بھی کھنچوائی تھی۔ یہی اس کے قفل خباثت کی کلید تھی۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ مولانا کی بیعت کتنے لوگوں نے کی تھی۔"

حاجی ترنگ زئی

حاجی صاحب[1] ترنگ زئی صوبہ سرحد کے ان عظیم رجال میں سے تھے جنھوں نے اپنے صوبے میں مجاہدین آزادی اور احرار اسلام کو منظم کیا اور تحریکِ آزادی کو آگے بڑھانے اور اسلامی زندگی اور نظم جماعت کے قیام کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کو صرف کر دیا اور زندگی کے آخری لمحوں تک وہ ملک اور ملت کی اسی بہی خواہی اور خیر خواہی میں مصروف رہے۔ حاجی صاحب نے برٹش استعمار پر کاری ضربیں لگائیں، مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ، عقائد کی اصلاح، اعمال کی درستگی، اخلاق کی تہذیب اور تبلیغ و اشاعت میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ وہ سب سے پہلے پشتون قائد ہیں جنھوں نے پشتون قوم کی اس مردگی اور گھٹن کو محسوس کرتے ہوئے ۱۹۱۰ء میں ضلع

---

[1] اس مضمون کی تالیف میں "صوبہ سرحد کے چند مجاہد" از فارغ بخاری۔ العلم کراچی، جولائی ۱۹۷۰ء، حاجی صاحب ترنگ زئی از اختر راہی۔ الحق اکوڑہ خٹک دسمبر ۱۹۷۳ء، حکیم محمد اسلم سنجری کی "خود نوشت" اور راقم کے نام ان کے متعدد مکاتیب سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

پشاور میں (جس میں اس وقت مردان بھی شامل تھا) اپنے تبلیغی اور اصلاحی مشن کا آغاز کیا اور اس مہم کو اس تن دہی اور سرگرمی سے انجام دینے لگے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ضلع بھر کے لوگوں کے تمام خانگی جھگڑے نبٹا ڈالے اور قتل کے مقدمات عدالتوں کے بجائے آپ کے قائم کردہ عوامی جرگوں میں فیصل ہونے لگے اور کچہریاں اجڑی ہوئی اور ویران نظر آنے لگیں کیونکہ کسی کو وہاں جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی۔ آپ نے فضول، بری اور غیر اسلامی رسومات بند کرانے میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی اور شادی و موت کے مواقع پر جو غیر شرعی رسوم پشتونوں میں رواج پا گئی تھیں انھیں یک قلم بند کرا دیا۔ ان کوششوں کے علاوہ آپ نے مسلمانوں کی اصلاح اور اسلامی تعلیمات و احکام کی تعلیم و ترویج کے لیے ستر سے زیادہ مدارس اسلامیہ قائم کیے ان کی کوششوں سے صوبہ سرحد میں سیاسی بیداری اور اسلامی زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ پشتون قوم میں ایک نئی زندگی کے برگ و بار پیدا ہو گئے۔ فارغ بخاری صاحب کے بقول "یہ پہلا موقع تھا کہ ایک مصلح نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اسے اسلامی اور قومی زندگی سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ اس لیے صوبہ سرحد کے عوام میں حاجی صاحب نے ایسی ہر دل عزیزی حاصل کر لی جس کی مثال اس صوبے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔"

حاجی صاحب کا نام فضل واحد تھا۔ چارسدہ تحصیل کا ایک موضع ترنگ زئی ان کا آبائی گاؤں ہے اور اس تعلق سے وہ حاجی صاحب ترنگ زئی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ان کا ننھیال اور ددھیال کئی صدیوں سے علم و فضل،

زہد و تقویٰ اور دنیاوی و دینی وجاہتوں کے لحاظ سے پورے صوبے میں ممتاز تھا۔ علم و تقویٰ کی یہ تمام روایات حاجی صاحب کے حصے میں بھی آئیں۔

مرحوم حاجی صاحب ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ خاندانی دستور کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی تعلیم و تربیت میں مبداء فیاض سے مستفید ہوئے ہیں۔ ان کا مقام رسمی اور مروجہ علوم و فنون کے پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ ملا نجم الدین عرف ہڈے ملا سے بیعت اور ان کے خلیفۂ مجاز تھے اور برٹش استعمار کے خلاف حضرت شیخ الہند کی تحریک جہاد کے خاص رکن تھے۔ جب ایک سیاسی منصوبے کے مطابق مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے کابل کو ہجرت فرمائی حضرت شیخ الہند حجاز تشریف لے گئے اور مولانا سیف الرحمٰن دہلی سے پشاور پہنچے، پشاور کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور مولانا ابوالکلام آزاد کی جماعت "حزب اللہ" کی شاخ قائم کی تو اس کی رہنمائی کے لیے ان کی نظرِ انتخاب حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی پر پڑی چنانچہ حزب اللہ کا رئیس انہی کو مقرر کیا گیا۔

۱۹۱۳ء میں انھیں گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن ان کی گرفتاری کے ردِ عمل سے ڈر کر حکومت نے انھیں رہا کر دیا لیکن جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور دوبارہ ان کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے گئے لیکن حاجی صاحب پھر ان کے ہاتھ نہیں آئے۔ ۱۹۱۵ء میں حاجی صاحب آزاد قبائل کی طرف ہجرت کر گئے۔ اس کے بعد انگریزوں کے خلاف بنیر، شب قدر، ڈکر، میتھی اور غلی کے محاذوں پر اور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۵ء تک تقریباً بیس سال کے

عرصے میں انگریزوں سے جو بیسیوں مقابلے اور جھڑپیں ہوئیں ان میں سے اکثر میں حاجی صاحب نے بہ نفسِ نفیس حصّہ لیا۔

حاجی صاحب کا شمار ان اصحابِ عزیمت میں ہوتا ہے جنھیں دولت و ثروت کا کوئی لالچ، زندگی کی کوئی راحت و آسائش اور حکومت و اقتدار کے ظلم و تشدد کا کوئی حربہ جہاد فی سبیل اللہ کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ ان کی عزیمت، اصابت رائے، دُور بینی اور ذہانت کے مقابلے میں انگریزی حکومت کی ہر چال کو ناکامی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا لیکن ملّت کے غدّار ہاتھوں سے انھیں زندگی کے بہت سے دُکھ جھیلنے پڑے۔ اس وقت جبکہ ان کی عمر اسی سال کی ہو چکی تھی۔ انگریزوں نے ان کے ایک قریبی شخص کو رشوت دے کر ان کے موزوں میں زہر ڈلوا دیا جس سے ان کے جسم میں زہر پھیل گیا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے اور بالآخر اسلاف کے ایمان و عمل کی یہ نشانی اور تحریک آزادی کا یہ عظیم رہنما ۱۹۳۷ء میں اکیاسی برس کی عمر میں رفیقِ اعلیٰ سے جا مِلا۔ آپ کی وصیت کے مطابق آزاد قبائل میں ایک مقام غازی آباد کی مسجد کے صحن میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

حکیم محمد اسلم سنجری کی روایت کے مطابق ایک موقع پر اسلامیہ کلب پشاور کے ایک جلسے میں ہزاروں مسلمانوں نے بیعت جہاد کی تھی لیکن جن حضرات کے نام معلوم ہیں وہ صرف تین ہیں۔ حاجی صاحب ترنگ زئی، محمد اسلم سنجری اور ان کے والد قاضی گُل احمد سنجری۔ اسلم سنجری کا بیان ہے کہ حاجی صاحب ترنگزئی نے غالباً مسجد مہابت خاں میں نمازِ جمعہ کے بعد مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی۔

قاضی گُل احمدؒ سجزی

قاضی گُلؒ احمد ایک علمی اور سیاسی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے پردادا قاضی عبداللہؒ سجزی احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے معرکہ پانی پت میں شریک تھے اور نمایاں خدمات انجام دینے کے صلے میں علاقہ پشاور میں ایک بڑی جاگیر پا کے درس و تدریس اور عبادتِ الٰہی میں مصروف ہو گئے تھے۔ قاضی عبداللہ کے چھ بیٹے تھے، ان میں سے پانچ سِکھوں سے ایک مقابلے میں شہید ہو گئے تھے۔ سب سے چھوٹے اور چھٹے بیٹے کا نام فضل احمد تھا۔ اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی اس لیے قتل ہونے سے بچ گئے لیکن قید کر لیے گئے اور رنجیت سنگھ کے دربار میں پہنچائے گئے۔ رنجیت سنگھ ان کی کم عمری اور ذاتی وجاہت سے بہت متاثر ہُوا۔ اس نے انھیں اپنے گھر میں رکھا اور بچّوں کی طرح پرورش کی۔ یہ اپنی خداداد صلاحیتوں اور عقل و دانش کی بنا پر اس خاندان کے ایک محبوب فرد بن گئے، جوان ہُوئے

---

[1] اس مضمون کی تالیف میں فارغ بخاری کے مضمون "صوبہ سرحد کے چند مجاہد" اور محمد اسلم سجزی کی خود نوشت اور راقم کے نام ان کے خطوط سے مدد لی گئی ہے۔

تو رنجیت سنگھ نے انھیں پنج ہزاری منصب سے نوازا اور پشاور بھیجا لیکن جلد ہی ان کا سکھوں کے فرانسیسی گورنر ایبی ٹیبل سے اختلاف پیدا ہوگیا اور اس کے ساتھ ایک معرکہ میں ایک ہاتھ سے محروم ہو گئے۔ کئی سال تک نظر بندی کی مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد رہا ہوئے اور خانہ نشین ہو گئے ان کے ایک بیٹے قاضی سید احمد تھے ان کا اصل میدان تجارت تھا لیکن سیاست سے بھی بالکل کنارہ کش اور بے تعلق نہ تھے۔ انگریزوں کے خلاف جہاد میں انھوں نے بھی سپہ گری کے جوہر دکھائے۔ حکیم محمد اسلم سنجری لکھتے ہیں:

"امیر عبدالرحمٰن خاں کے عہد میں صاحبِ صورت ملا عبدالغفور نے صورت اور مالاکنڈ کے علاقوں میں جو تاریخی محاربات انگریزوں سے کیے ان میں قاضی سید احمد سنجری پیش پیش تھے۔۔۔۔۔ جنگ بنیر میں جب ملا نجم الدین مرحوم جو اڈے ملا صاحب کے نام سے مشہور تھے، سر سے کفن باندھ کر انگریزوں سے جہاد کر رہے تھے تو میرے جدِ محترم بھی ان کے ساتھ سپر آزما تھے۔ اس جنگ میں انھیں دو زخم آئے، ایک تلوار کا اور ایک قرابین کا، لیکن شہید نہیں ہوئے۔"

قاضی گل احمد سنجری انہی قاضی سید احمد سنجری کے صاحبزادے تھے۔ قاضی گل احمد بھی ایک صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے۔ انگریزوں کے شدید ترین مخالف تھے اس فرض کو علمی اور عملی دونوں طور پر ادا کیا، کتابوں کی تجارت کرتے تھے، وہ ایک

پریس کے مالک بھی تھے جس کے ذریعے سے انھوں نے دینی، تاریخی اور درسی کتب چھاپ کر پشتو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا اور ایک ہفت روزہ اخبار نکال کر اہل صوبہ کی دینی اور سماجی اصلاح و تربیت میں بھی حصہ لیا اور علم و ادب کی ترویج و اشاعت کی خدمات بھی انجام دیں۔ حکیم محمد اسلم سنجری لکھتے ہیں:

"میرے والد قاضی گل احمد سنجری تاجر کتب تھے اور ایک لیتھو پریس بھی لگا رکھا تھا۔ یہ پہلا پریس تھا جو پشاور میں روشناس ہوا اس میں دینی، تاریخی اور مختلف درسی کتب چھپا کرتی تھیں۔ میرے والد کو لکھنے پڑھنے کا بہت ذوق تھا۔ انھوں نے ایک ہفت روزہ اخبار بنام افغان کا اجراء کیا تھا۔ یہ اخبار اردو اور پشتو زبانوں میں تھا۔ خبروں کے علاوہ اس میں نہایت بلند پایہ مذہبی، تاریخی، معاشی اور فلسفیانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ پشاور میں یہ پہلا ہفت روزہ تھا۔ رائے عامہ کی تربیت و تہذیب میں اس اخبار نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے اکثر و بیشتر مضامین قبلہ والد صاحب قاضی گل احمد سنجری کے قلم سے نکلتے تھے۔ یہ اخبار بے باک نویسی کی وجہ سے اپنے دور میں بہت مشہور تھا۔ ایک عرصے تک نکلنے کے بعد ایک مضمون کی وجہ سے سر جارج روس کیپل کے ابتدائی دور میں بند کر دیا گیا۔ اس مضمون میں والد مرحوم نے حکومت کی انتظامیہ کے ناقص نظم و ضبط پر شدید حملے کیے تھے۔"

اخبار نویسی کا شوق انھیں زندگی بھر رہا چنانچہ جب ہجرت کر کے کابل گئے تو وہاں سے بھی ایک اخبار جاری کیا اور جب تک حالات نے اجازت دی اسے جاری رکھا۔ محمد اسلم سجزی صاحب لکھتے ہیں :

"تحریک حزب اللہ کے مقاصد کی تکمیل کے لیے جب آپ (گل احمد سجزی) ۱۹۱۹ء میں ہجرت کر کے کابل پہنچے تو وہاں سے بھی ایک اخبار "استقلالِ افغان" تین زبانوں پشتو، فارسی اور اردو میں نکالا تھا۔ اس اخبار میں راجہ مہندر پرتاب مستقل طور پر لکھا کرتے تھے، مولانا عبید اللہ سندھی اور دیگر زعمائے ترک موالات کے مضامین بھی گاہے گاہے شائع ہوتے رہتے تھے۔ معاون ادارہ کے طور پر میں کام کرتا تھا بعد میں انگریزوں کے ایماء پر کابل حکومت نے اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ میرے والد نے جہاد ترکہ اور ہزارناؤ میں نہایت نمایاں خدمات انجام دیں۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں :

"الغازی قاضی گل احمد سجزی حزب اللہ (پشاور) کے معتمد تھے ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک قید فرنگ میں رہے۔ اس دور میں میں بھی ان کے ساتھ گرفتار تھا۔ ہم دونوں باپ بیٹے کو موت کی سزا سنائی جا چکی تھی۔ تقریباً چار سال تک پھانسی کی کوٹھڑی میں امید و بیم کی حالت میں گرفتار رہے۔ جنگ آزادیِ افغانستان

میں پشاور اور مہمندوں کے محاذ پر سالار و منتظم تھے نیز ترک موالات
میں نہایت سرگرم حصہ لیا، جنگ ہزارناؤ (جلال آباد و ڈھکہ)
میں حاجی صاحب ترنگ زئی، بادشاہ گل صاحب کی معیت
میں مہمند آفریدی اور پشاور مجاہدین کے سرغنہ تھے۔ یہ جنگ
افغانستان کی آزادی حاصل ہونے تک ایک سال تک
جاری رہی۔ آپ کابل میں .... حبیبیہ کالج میں نائب پرنسپل
رہ چکے تھے۔ کابل میں بعمر صد سالگی اس مردِ غازی نے وفات
پائی۔ اس وقت میں قلعہ شاہی میں اپنی قید کا سولھواں برس
کاٹ رہا تھا۔ مجھے جنازے میں شرکت کی اجازت ملی اور واپسی
پر پھر اپنے حجرۂ محبس میں داخل کر دیا گیا۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کے شیدائیوں میں سے تھے، مولانا سے خط و کتابت بھی تھی اور مولانا کے ہاتھ پر بیعت جہاد بھی کی تھی۔ راقم کے نام ایک خط میں محمد اسلم سنجری لکھتے ہیں: "میرے والد صاحب اور حاجی صاحب ترنگ زئی مرحوم دو ہی آدمیوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے دستِ شفقت اثر پر خفیہ بیعت کی تھی۔" اس خط میں لکھتے ہیں: "میرے والد قاضی گل احمد مرحوم نے پہلے بیعت صاحبزادہ عبدالقیوم خاں کے گھر پر کی، اس کے دوسرے دن مولانا نے مجھے اپنی بیعت سے نوازا۔" (مکتوب مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۳ء) ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد پشاور آئے۔ اسلامیہ کلب کے جلسے میں انہوں نے وہ غضب ناک تقریر کی جو

حضرت عمرؓ کے جلال کو تازہ کرتی تھی۔ رات کو سر صاحبزادہ عبدالقیوم کے ہاں مولانا کو دیکھا اور ہم نے تجدید بیعت کی"۔ (مکتوب مورخہ ۲۶ راکتوبر ۱۹۷۲ء)

محمد اسلم سجزی کی تمام تحریروں اور ان اقتباسات کے مطالعے کے بعد میرے ذہن میں واقعاتِ بیعت کی ترتیب یہ بنتی ہے:

۱۔ ایک موقع پر مسجد مہابت خاں میں نمازِ جمعہ کے بعد حاجی صاحب ترنگزئی نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی۔

۲۔ اسی سفر کے موقع پر یا کسی دُوسرے موقع پر قاضی گُل احمد سجزی اور محمد اسلم سجزی نے صاحبزادہ عبدالقیوم کے مکان پر بیعت کی۔

۳۔ اسلامیہ کلب کے جلسے میں مولانا نے جہاد پر لوگوں سے بیعت عام لی۔

۴۔ پھر ایک موقع پر صاحبزادہ عبدالقیوم کے مکان پر محمد اسلم سجزی اور شاید ان کے والد نے بھی تجدید بیعت کی۔

اسلامیہ کلب کے جلسے میں بیعت عام کے علاوہ دوسرے موقع پر بھی ممکن ہے اور لوگوں نے بھی بیعت کی ہو لیکن ان حضرات کے نام معلوم نہیں ہوسکے۔

حکیم محمد اسلم سنجری

محمد اسلمؒ سنجری ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ قاضی گل احمد سنجری کے دوسرے بیٹے ہیں۔ ایک بھائی ان سے بڑے اور دو چھوٹے ہیں۔ بڑے بھائی قاضی غلام محی الدین محمود سنجری تھے جو قاضی محمود سنجری کے نام سے مشہور تھے یہ امیر امان اللہ خاں والیِ افغانستان کی جانب سے بخارا میں سفیر رہ چکے تھے ان کا انتقال ہوگیا۔ چھوٹے بھائیوں میں محمد عنایت اللہ سنجری بقید حیات ہیں۔ یہ امان اللہ خاں کے ترجمان تھے۔ نادر شاہ کے عہد میں نیم سرکاری اخبار الاصلاح کے ایڈیٹر تھے۔ سب سے چھوٹے بھائی کا نام نجم الدین احمد تھا۔ عالم شباب میں کابل میں وفات پائی۔ چار بہنیں تھیں جن میں سے ایک بہن بقید حیات ہیں۔

محمد اسلم سنجری کا بچپن کوہاٹ اور پشاور میں گزرا۔ تعلیم کا آغاز گھر پر ہوا اس کے بعد اسلامیہ کالج پشاور کی جماعت چہارم میں داخل کرا دیئے گئے۔ دو سال گزرے تھے کہ ان کے دادا جو ایک مدت سے کشمیر میں بسلسلۂ تجارت

ل‍ہ اس مضمون کی تالیف میں محمد اسلم سنجری صاحب کی خود نوشت، راقم کے نام ان کے خطوط اور فارغ بخاری کے مضمون صوبہ سرحد کے چند مجاہد سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مقیم تھے، پشاور تشریف لے آئے اور یہ دیکھ کر سخت برافروختہ ہوئے کہ ان کا پوتا انگریزی اسکول میں پڑھ رہا ہے۔ انھوں نے اسلم صاحب کی تعلیم کا یہ سلسلہ فوراً منقطع کروا دیا اور گھر پر اپنی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا۔ اسلم صاحب نے عربی، فارسی، تفسیر، فقہ، طب اور علوم ادبیہ کی تکمیل کی۔ ان کے دادا اور والد مرحوم طب اور خطاطی میں کمال رکھتے تھے چنانچہ انھیں بھی یہ فنون سکھائے گئے۔ اسلم صاحب لکھتے ہیں: "تحصیل علم کا عہد ۱۹۱۳ء تک رہا اس دوران میں علوم دینی، ادب، شاعری، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ اور طب کا عمیق مطالعہ کیا اور ان علوم میں فارغ التحصیل ہو گیا۔"

سیاسی تربیت بھی انھیں گھر ہی میں ملی۔ ان کے جد مرحوم اور والد ماجد سیاسی فکر و نظر کے بزرگ تھے۔ سیاسی ذہن اور مزاج رکھنے والے لوگوں سے ان کی صحبتیں رہتی تھیں۔ انہی صحبتوں میں اسلم صاحب کی سیاسی تربیت ہوئی اور انہی مجالس میں ان کے ذہن و فکر کو جلا ملی۔ بعد میں انھیں خود بھی ملک کی بعض اہم سیاسی شخصیات کی خدمت میں نیاز حاصل ہو گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا عبید اللہ سندھی اس سلسلے کی خاص شخصیات ہیں اس طرح ان کے سیاسی تعلقات کا دائرہ بنگال سے لے کر پنجاب اور افغانستان تک پھیلا ہوا تھا۔ اسلم صاحب لکھتے ہیں:

"دادا جان کے پاس اکثر و بیشتر قبائلی ملک و خوانین آتے رہتے تھے اور کبھی کبھی ان تمام لوگوں کا اجتماع نہایت ہی اہم مسائل سے متعلق ہوتا تھا۔ حاجی صاحب ترنگ زئی، مولانا سیف الرحمٰن

صدر جامعہ فتح پوری دہلی اور دیگر زعماء بھی ان اجتماعات میں شریک ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں اور سیاسی افکار و خیالات سے میں واقف ہو چکا تھا ان اجتماعات میں شرکت کے بعد میرا سیاسی شعور آئندہ خیالات کے لیے جلا پا چکا تھا۔ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے خط وکتابت شروع کی اور ان سے رابطہ پیدا ہو گیا۔ اس تعلق کا پیدا ہونا تھا کہ فکر و نظر کی روشنی مل گئی اور دل کے اضطراب و اضطرار کو آسودگی حاصل ہو گئی۔ یہ میری تعلیم و تربیت کا دوسرا مرحلہ تھا اور یہی آخری مرحلہ بھی ثابت ہوا کیونکہ اس کے بعد کی تمام درماندگی اور آبلہ پائی ان افکار و خیالات اور نظریۂ حیات کی تکمیل پر منتج ہوئی جس کا خاکہ مولانا آزاد سے منسلک ہو کر مرتب ہو چکا تھا۔

کسیکہ محرم بادصباست میداند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقی ست"

محمد اسلم سجزی کا سب سے پہلے سیاسی تعلق کانگریس سے ہوا۔ پھر وہ غدر پارٹی میں شامل ہو گئے اور نہایت سرگرمی کے ساتھ سیاسی خدمات انجام دیں۔ دینی اور اصلاحی تحریکوں سے بھی تعلق رہا۔ اس کے بعد ان کی تمام سرگرمیاں حزب اللہ کے لیے وقف ہو گئیں۔ حضرت سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد کے باقیات صالحات مجاہدین یاغستان سے ان کا بہت قریبی تعلق تھا۔ اندرونِ

ملک سے جو امداد مجاہدین کو بھیجی جاتی تھی، اس سلسلے کی درمیانی کڑی محمد اسلم سجزی تھے سب سے پہلے امداد پشاور پہنچتی تھی پھر موصوف اس کو یاغستان بھجوانے کا انتظام کرتے تھے۔ مولانا آزاد، مولانا عبدالقادر قصوری، امیر المجاہدین نعمت اللہ، مولانا عبیداللہ سندھی وغیرہم اس سلسلے کے تمام حضرات کا آپ کو اعتماد حاصل تھا۔ ۱۹۱۵ء میں برٹش استعمار کے خلاف متعدد جنگی معرکوں میں بھی حصّہ لیا تھا۔

صوبہ سرحد میں انڈین ڈیفنس ایکٹ نافذ ہوا تو اس کا سب سے پہلا شکار محمد اسلم، ان کے بھائی محمود اور والد ماجد قاضی گل احمد سجزی ہوئے تھے ۱۹۱۵ء میں گرفتار ہوئے اور تین سال پانچ ماہ کی قید کے بعد اواخر ۱۹۱۸ء میں رہا ہوئے۔ اسی زمانے میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے کابل میں ہندوستان کی آزاد حکومت بنائی تو صوبہ سرحد میں اس کا نمائندہ اسلم سجزی کو مقرر کیا گیا تھا ۱۹۱۹ء میں اسلم صاحب اپنے والد اور بھائیوں کے ساتھ کابل ہجرت کر گئے ابتلاء و آزمائش کی زندگی نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ مختلف اوقات میں چار بار گرفتار ہوئے۔ پہلی بار مجلس حبیب اللہ خاں میں قید رہے۔ سزائے موت کا حکم ہوا لیکن تقریباً چھ ماہ بعد رہا کر دیئے گئے، دوسری مرتبہ مجلس نادری برجہ تقیل و برجہ گنبد میں چار سال تک قید رہے۔ تیسری بار مجلس زماں میں تقریباً تیرہ برس کے لیے قید کر دیئے گئے اور چوتھی مرتبہ مجلس محمد ایوب خاں میں آٹھ سال اور چند ماہ تک پابند سلاسل رہے۔ اس طرح ان کی مجموعی مدتِ اسارت اٹھائیس برس اور چند ماہ بنتی ہے گویا کہ قیامِ پاکستان تک ملک اور ملت کے

عشق میں انھوں نے اپنی نصف زندگی اور جو بلاشبہ نصف بہتر تھی قید و بند میں بسر کر دی۔ انھیں چار مرتبہ پھانسی کا حکم سنایا گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر مرتبہ ان کی زندگی کی حفاظت کی۔ ان ابتلاؤں اور آزمائشوں کے بعد بھی ملک و ملت کے عشق کا شعلۂ فروزاں سرد نہیں پڑ گیا بلکہ اس سزا و ابتلاء کے بعد ذوق گنہ اور زیادہ ہی ہو گیا۔ وطن واپس آنے کے بعد پہلے خدائی خدمت گار اور پھر نیشنل عوامی پارٹی، پشاور کے صدر کی حیثیت سے عوام کی فلاح و بہبود اور ملک کی تعمیر کے کاموں میں حصہ لیتے رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ان کے لیے کوئی اجنبی شخصیت نہ تھے۔ ان کے دادا اور والد کے مولانا آزاد سے تعلقات تھے۔ ان کے والد کی مولانا سے خط و کتابت بھی تھی بعد میں خود ان کے بھی مولانا آزاد سے تعلقات ہو گئے تھے مولانا آزاد ان پر نہایت خفیہ امور میں اعتماد کرتے تھے۔ یہ داستان اسلم صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"کانگریس اور غدر پارٹی میں میں نے نہایت ممتاز خدمات سرانجام دیں لیکن اب تک روح میں ایک پھانس چبھی ہوئی تھی۔ اب تک ملک و وطن کی خدمت علانیہ طور پر کرنے کا کوئی موقع میسر نہ آیا تھا۔ اس دور میں مولانا محمود حسن قبلہ اسیر مالٹا ہندوستان واپس آئے۔ انھوں نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ایک تنظیم کی ضرورت محسوس کی تاکہ اسلامیانِ ہند کی سیاسی تربیت کا بندوبست بحیثیت جماعت ہو سکے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس

دور میں کانگریس کے ممتاز ترین رہنما ہونے کے باوجود مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کے خواہاں تھے جو مسلمانوں کے افکار وخیالات میں انقلابی تبدیلی پیدا کر سکے۔ ان مقاصد کے مدّنظر مولانا محمود حسن کے ایما اور سعی سے حزب اللہ نام کی ایک تنظیم قائم کی گئی۔ حزب اللہ باعتبار ساخت مذہبی جماعت تھی اور اس کا نصب العین اسلامی افکار ونظریات کی اشاعت وترویج تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور الہلال کے خار اشگاف مضامین نے اسلامیانِ ہند کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بہت ہی کم مدّت میں حزب اللہ کی پورے ہندوستان میں شاخیں پھوٹ پڑیں اور ہر جگہ اپنی اپنی بساط کے مطابق لوگوں نے خدمات سرانجام دینا شروع کیں۔

میرا گھرانا ابوالکلام آزاد کے شیدائیوں میں سے تھا۔ میرے والد اور خود مجھ سے مولانا کی خط وکتابت تھی، الہلال آتا تھا اور اس کا ایک ایک حرف پڑھنا اور معنی ومفہوم پر بحث کرنا محبوب مشغلہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو ہم لوگوں پر اعتماد تھا"۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس تحریک حزب اللہ سے دلچسپی اور تحریکِ جہاد سے ان کے شغف کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی جس کا تذکرہ موصوف کے والد مرحوم کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

اعلان

خلافت اسلامی و بلاد اسلامیہ کا آخری فیصلہ

مسلمانانِ ہند کے فرائض شرعیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا ایھا الذین آمنوا مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض ارضیتم بالحیوۃ الدنیا من الاخرۃ فما متاع الحیوۃ الدنیا فی الاخرۃ الا قلیل (توبہ : ۳۸)

مسلمانوں! تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہو" تو تمہارے قدموں میں حرکت نہیں ہوتی تم زمین پر ڈھیر ہوتے جاتے ہو۔ کیا تم نے آخرت کا خیال بالکل چھوڑ دیا اور آخرت کے بدلے دنیا کی چند روزہ زندگی پر قناعت کرلی اگر ایسا ہی ہے تو افسوس تمھاری نامرادی پر! یاد رکھو کہ جس زندگی اور اس کی فانی لذتوں پر تم ریجھے بیٹھے ہو وہ آخرت کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہے۔

الحمد للہ وحدہ۔ میری خاموشی بلاوجہ نہ تھی اور نہ فکر وعمل سے خالی نہایت کثرت سے لوگ زبانی خط اور تاروں کے ذریعے دریافت کرتے رہے کہ مسئلہ خلافت کے سلسلے میں آئندہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے اور احکام شرع اس بارے میں کیا ہیں میں نے مختصراً جوابات دیئے لیکن کوئی عام اعلان نہیں کیا۔

اعمالِ شریعت دو قسم کے ہیں: انفرادی اور اجتماعی۔ انفرادی سے مقصود وہ اعمال ہیں، جن کو الگ الگ ہر فرد انجام دے سکتا ہے۔ جیسے نماز روزہ اجتماعی سے مقصود وہ اعمال ہیں جن کی انجام دہی کے لیے جماعت کا ہونا ضروری ہے۔ الگ الگ ہر فرد انجام نہیں دے سکتا، جیسے نماز جمعہ، پہلی قسم کے اعمال کی تبلیغ کے لیے اس قدر کافی ہے کہ ان کے وجوب وعمل کا حکم دے دیا جاتے اور بتلا دیا جائے کہ لوگ اِس طرح انجام دیں لیکن دوسری قسم کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ حصول وقیام کا بھی انتظام کرنا چاہیئے کیوں کہ انفراداً وہ اعمال انجام نہیں پا سکتے۔ جب تک جماعت کا انتظام نہ ہو جاتے۔ مثلاً جمعہ کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہ ہو گا کہ ادائے جمعہ کا طریقہ بتلا دیا جاتے بلکہ جماعت کا بھی انتظام کرنا چاہیئے تاکہ جمعہ عملاً انجام پا سکے۔

موجودہ منزل درپیش ہے اس کے اعمال اجتماعی ہیں نہ کہ انفرادی پس محض تجویز کا اعلان سود مند نہ تھا جب تک قیام وتنقید کا بھی کوئی انتظام نہ ہو جاتا ہیں بقدر استطاعت اِس کام میں مشغول تھا۔ مواقع بے شمار تھے مفاسد چند در چند کام عظیم الشان تھا اور عند اللہ وعند الناس ذمہ داری اشد۔ با ایں ہمہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم نے چارہ سازی فرمائی اور اس امر عظیم وخطیر کے بارگران کو طلب گاران راہ کے لیے بالکل آسان وسُبک کر دیا اب میں مستعد ہوں کہ اِس بارے میں جو بصیرت رکھتا ہوں لوگوں کے سامنے بلا کسی احتجاب واخفا کے پیش کر دوں اور جس راہ پر خود چل رہا ہوں اس کی طرف دوسروں کو بھی دعوت دوں۔

الا فاسقنی خمراً و قل لی ھی الخمر
ولا تسقنی سراً فقد امکن الجھر

ا۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے وہ عمل و راہ عمل کی جستجو کا معاملہ ہے۔ عمل کی جستجو میں جو حیرانی و مجہولیت لوگوں پر طاری ہے وہ نہایت تعجب انگیز ہے۔ خلافت و بلاد اسلامیہ کا مسئلہ دینی مسئلہ ہے اور اِس درجہ اہم ہے کہ ایمان و نفاق تک کا فیصلہ کر دیتا ہے اِس بات پر سب لوگ متفق ہیں۔ پس اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو ضرور ہے کہ مسلمان اِس بارے میں جو کچھ کریں اِس کی تمام تر بنیاد احکام شرع پر ہو۔ محض کسی انسان کے قیاس و تخمین پر نہ ہو جس کو صاحب شرع نے رائے سے تعبیر کیا ہے۔

جو شریعت مسلمانوں کو صاف صاف حکم دیتی ہے کہ خلیفہ وقت کی اطاعت و اعانت اور بلاد اسلامیہ کا دفاع فرض ہے۔ اِس کو صاف صاف یہ بھی بتلا دینا چاہیئے کہ جب اِس کا وقت آ جائے تو مسلمان کیوں کر اپنا فرض انجام دیں۔ جو کچھ شریعت نے بتلایا ہو مسلمان اِس پر عمل کریں۔ اِس میں اس قدر الجھن، اِس قدر کاوش، اس قدر حیرانی، اِس قدر سرگردانی کیوں ہے؟

اسلام کا اعلان ہے کہ دین کامل ہو چکا: الیوم اکملت لکم دینکم .... الخ

اور دین کامل وہی ہے جو اپنے پیروؤں کی ہر عہد اور ہر

حالت میں رہنمائی کر سکے۔ پس اگر اسلام مسلمانوں کو ایسے اہم اور بنیادی معاملے میں بھی یہ نہیں بتلا سکتا کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے حتیٰ کہ وہ مہینوں سرگرداں و حیران رہتے ہیں پے در پے مشوروں کے جلسے کرتے ہیں متحیر ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں اور پھر مجبور ہوتے ہیں کہ کسی غیر شرعی تجویز پر کاربند ہونے کا اعتراف کرلیں تو اس سے بڑھ کر اسلام کی بے مایگی و تہی دستی اور نقص شریعت کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے ؟۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں جو بات جس قدر زیادہ سچی ہوگی اتنی ہی زیادہ صاف اور سہل بھی ہوگی۔ پس شریعت کے حکموں میں نہ تو دراڑ ہے نہ پیچ و خم کہ ان کے حل کرنے سے عقلیں درماندہ اور فکریں سرگشتہ ہوں۔ اس کے تمام احکام بالکل صاف صاف اور سورج کی روشنی کی طرح کھلے اور بے نقاب ہیں۔

اس کی شام بھی اتنی ہی روشن ہے جتنی صبح۔ بس اگر خلافت کا مسئلہ دینی مسئلہ ہے تو اس کی جد و جہد کی ہر منزل کے لیے شریعت کے احکام کو بھی بالکل اسی طرح صاف اور واضح ہونا چاہیئے جیسے اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو ان کو کوئی ایسا راز نہیں ہونا چاہیئے جس کے حل کرنے کے لیے مہینوں کی حیرانیاں اور مجلسوں کی ہنگامہ آرائیاں مطلوب ہوں اور پھر بھی حل نہ ہوں۔

اسلام کا مسلمہ حکم ہے کہ خلیفۂ اسلام کی اطاعت وحمایت اور غیر مسلم حملہ آوروں کے مقابلے میں دفاع مسلمانوں پر فرض ہے جو اس سے انکار کرے وہ ایسی شدید معصیت میں مبتلا ہوگا جس کے بعد کفر صریح کے سوا ضلالت کا کوئی درجہ نہیں۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی محارب فوجیں بلاد اسلامیہ پر قابض ہیں اور آخری اعلان شرائط صلح کی صورت میں ہو چکا ہے خود دارالخلافہ پر انگریزی تسلط ہے۔

مسلمانوں کی جانباز جماعتیں وہاں سرگرم دفاع ہیں ان کے مقابلے میں برطانیہ کی قوتیں علانیہ خرچ ہو رہی ہیں۔ پس قانون اسلام میں "فریق محارب" کے جو معنی ہیں وہ ٹھیک ٹھیک اپنے آخری اور کامل معنوں میں برٹش گورنمنٹ پر صادق آ گئے۔

ا۔ اس گورنمنٹ کے ماتحت ہندوستان میں چھ کروڑ سے زیادہ مسلمان بستے ہیں۔ شرعاً ان پر بھی وہ فرائض عائد ہوتے ہیں جن کا ایسے وقتوں میں شریعت نے حکم دیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ شریعت ان کو یہ بتلاتی ہے کہ دفاع فرض ہے اس کو یہ بھی تو بتلانا چاہیئے کہ اگر ایسی صورت پیش آ جائے جیسی مسلمانان ہند کو اب پیش آئی ہے تو شرعاً کیا کرنا چاہیئے یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اسلام مسلمانوں کو روزانہ ضروریات و اعمال کی چھوٹی چھوٹی باتیں تک بتلا دے لیکن یہ نہ بتلا سکے کہ چھ کروڑ انسان اپنا ایمان

کیوں کر محفوظ رکھ سکتے ہیں!

اگر کہا جائے کہ احکام ہم کو معلوم ہیں مگر ہندوستان میں ہماری حالت ایسی مجبوری اور بے بسی کی ہے کہ ان پر عمل نہیں کر سکتے تو یہ مجبوری دو حالتوں سے خالی نہیں یا واقعی ہے یا غیر واقعی اگر واقعی نہیں ہے تو وہ عذر ہی نہیں ہے۔ اگر واقعی ہے تو خدا کی شریعت عادلہ انسان کی فلاح و صلاح کے لیے ہے، ضیق حرج یعنی تنگی و جبر کے لیے نہیں۔ "وما جعل علیکم فی الدین من حرج" اور "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" اور حدیث ابی معاذ الی الیمن کہ "یسرا ولا عسرا" پس اس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہو سکتا جس پر بہ آسانی عمل نہ کیا جا سکے اور نہ کوئی عمل ایسا ہو سکتا ہے جو ہر حیثیت سے موجب رفاہ و فلاح نہ ہو۔ اس نے ہر حالت کے لیے حکم دیئے ہیں اور ہر طرح کے عذروں کی پذیرائی کی ہے اور ہر قسم کے حالات مقتضیات کی راہیں باز رکھی ہیں۔ طہارت کے لیے وضو کا حکم دیا لیکن اگر عذر پیش آجائے تو معذور کے لیے تیمم کا حکم بھی موجود ہے۔ معذور کے لیے تیمم کا عمل ویسا ہی صحیح و کامل ہے جیسا غیر معذور کے لیے وضو۔ پس اگر ہندوستان میں مسلمانوں کو واقعی عذرات درپیش ہیں تو عذرات کی صورت میں بھی مثل حکم تیمم کے کوئی حکم ہونا چاہیئے۔ وہ حکم کیا ہے؟ اس کو بتلانا چاہیئے اور (اس پر) عمل کرنا چاہیئے مسلمان حکومت و سلطنت سے تہی دست ہو جائیں لیکن

خدا کے لیے اسلام کو رہنمائی و ہدایت سے بھی دست ثابت نہ کرو۔ چھ کروڑ مسلمانوں میں ایک بھی خدا کا بندہ ایسا نہ رہا جو اسلام کے نور علم و ہدایت سے اس ظلمت و کوری ملت کو دور کر سکے اور مسلمانوں کو یہ کہہ سکے بلا سکے کہ علیٰ بصیرۃ وانا من اتبعنی کیا اسلام کی قوت تعلیم و تربیت اب اس قدر نامراد ہو گئی کہ نکموں کی اس پوری اقلیم میں ایک بھی کام کا انسان پیدا نہیں کر سکتی کسی زمانے میں ہر دوسرا مسلمان رہنما ہوتا تھا۔ کیا اب پورے چھ کروڑ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا شریعت دان نہیں جو از روئے شریعت لوگوں کی رہنمائی کر سکے۔ الیس منکم رجل رشید

اصل یہ ہے کہ موجودہ حالات نے آخری درجۂ یقین تک ظاہر کر دیا ہے کہ ہماری ایمانی و قلبی موت کہاں تک پہنچ چکی ہے لوگ اس کو علمی اور ذہنی تنزل سے تعبیر کریں گے۔ لیکن میں ایمانی تنزل کے سوا اور کوئی لفظ نہیں بول سکتا وہ چیز جس کو قرآن و سنت نے "قوت عزیمت" اور "سبقت بالخیرات" سے تعبیر کیا ہے۔ یک قلم مفقود ہو گئی ہے۔ سب اس کے لیے رہ گئے ہیں کہ ان کو کوئی دوسرا راہ دکھائے۔ خود راہ نکالنے اور لوگوں کے لیے دلیل راہ بننے کی قوت باقی نہیں رہی۔ موجودہ وقت کسی ایسے مرد راہ کا طالب ہے۔ جو صاحب عزم دامر ہو اور اس لیے نہ ہو کہ دوسروں کی چوکھٹ پر ہدایت و رہنمائی کے لیے سر جھکاتے بلکہ دوسرے اس لیے

ہوں تاکہ رہنمائی کے لیے اس کا منہ تکیں اور جب وہ قدم اٹھائے تو اس کے نقش قدم کو دلیل راہ بنائیں۔ اس کے سلطان فکر کی عزیمت تجویزوں اور بحثوں کی محتاج نہ ہو بلکہ کتاب اللہ کی بصیرت اور اسوۂ حسنہ نبوت کی حکمت نے اس کو تمام انسانی فکروں اور رایوں سے بے نیاز کر دیا ہو" ان الامانت منزلت من السمآئی جذر قلوب الرجال" (بخاری) اس کا قلب امانت کتاب وسنت کا حامل ہو اور قلوبہم مصابیح الھدی یخرجون من کل غبرا مظلمہ (رواہ ابن ماجہ) وہ اپنے اندر مصابیح ہدایت کی روشنی رکھتا ہو جو باہر کی تمام روشنیوں سے بے پروا کرے

باغ مراچہ حاجت سرو وصنوبر است
شمشاد خانہ پرور ما از کہ کمتر است

۲۔ یہ ساری مصیبت اور نامرادی اس لیے ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی جماعتی نظام موجود نہیں، جس کا انتظام شرعاً ان پر واجب تھا اور نہ ہدایت امت کے لیے کوئی صاحب امر و سلطان دماغ ہے عہد جاہلیت کی سی ایک طوائف الملوکی اور اجتماعی اختلال و برہمی ہے جس میں چھ کروڑ انسان مبتلا ہیں اور جماعتی زندگی کی اس معصیت کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے بند ہو گئے ہیں موجودہ حالات میں ان کی جتنی صورتیں شرعاً ہو سکتی ہیں ان سب کے لیے پہلی چیز "جماعت" ہے۔ چوں کہ جماعت مفقود ہے اس لیے کوئی راہ نہیں کھلتی اور خود سر گردان کار حیران ہو کر ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

۳۔ تمام دلائل شرعیہ، حالات حاضرہ، مصالح مہمہ امت اور مقتضیات صالحہ و موثرہ پر نظر ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہوگیا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کے لیے بجز ہجرت کے اور کوئی چارۂ شرعی نہیں ان تمام مسلمانوں کے لیے جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا عمل انجام دینا چاہیں ضروری ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں اور جو لوگ یکایک ہجرت نہیں کر سکتے وہ مستعد مہاجرین کی خدمت و اعانت اس طرح انجام دیں گویا وہ خود ہجرت کر رہے ہیں۔ یعنی اصل عمل جواب در پیش ہے، ہجرت ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں ہندوستان سے ہجرت قبل از جنگ بھی مستحسن تھی اب یہ استحسان شرائط شرعیہ کے ماتحت وجوب تک پہنچ گیا ہے۔ البتہ جن لوگوں کی نسبت ظن غالب ہو کہ مقصد کی جدوجہد اور کلمہ حق کے اعلان و تذکیر کے لیے ان کا قیام ہندوستان میں بہ مقابلہ ہجرت کے زیادہ ضروری ہے یا جو لوگ دیگر عذرات مقبولۂ شرعیہ کی بنا پر ہجرت نہ کر سکیں یا یکایک نہ کر سکیں یا ایک اتنی بڑی اور وسیع آبادی کی نقل و حرکت میں قدرتی طور پر جو تاخیر ہونی چاہیئے اس کی وجہ سے تاخیر ہو سو بلاشبہ وہ لوگ ٹھہر سکتے ہیں، لیکن ان کو اپنی تمام قوتیں اتباع شریعت کے لیے وقف کر دینی چاہیئے اور ایک منظم جماعت کی شرعی ہیئت پیدا کر کے زندگی بسر کرنی چاہیئے اور جہاں تک عزم و نیت کا تعلق ہے ہجرت کے ولولہ و تہیہ سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔ ہندوستان میں ایک ایسی جماعت کا قائم ہو جانا موجودہ حالات کی

بنا پر اصل کام ہوگا۔

٤۔ البتہ یہ واضح رہے کہ ہجرت کی جو صورت اس وقت ہندوستان میں درپیش ہے شرعاً اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ فرداً فرداً ہر شخص بطور خود نکل کھڑا ہو بلکہ ہجرت کے تمام اعمال جماعت کے ساتھ انجام پانے چاہئیں۔ اس بات کا فیصلہ کرنا صاحب جماعت کا کام ہے کہ کس شخص کو فوراً ہجرت کر جانا چاہیئے۔ اور کسی شخص کی استعداد ایسی ہے کہ اس کا قیام اندرونی خدمات کے لیے مطلوب و مفید ہے نیز ہجرت کی جائے تو کس مقام پر اور کن حالات کے ساتھ کہ موجب ثمرات و برکات ہو۔ ہر شخص بطور خود ان امور کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

جب ایک طالب عمل کو ہجرت کا حکم دے دیا گیا تو اس کے لیے ہجرت کرنا واجب ہو جائے گا۔

۵۔ اعمال ہجرت کا جو نمونہ اسوۂ حسنۂ نبوت نے ہمارے لئے چھوڑا ہے وہ یہ ہے کہ ہجرت سے مقدم ہجرت کی بیعت ہے، بغیر بیعت کے ہجرت نہیں کرنی چاہیئے۔ پس ضروری ہے کہ جو لوگ ہجرت کریں، پہلے ہجرت پر بیعت کر لیں۔

٦۔ مختلف اسباب کی بنا پر جن کی تشریح رسالہ ہجرت میں ملے گی یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ہندوستان سے بہ یک وقت تمام لوگ ہجرت کر سکتے ہیں اور نہ شرعاً مطلوب۔ ہجرت کا سلسلہ جاری رہے گا اور ہندوستان میں بھی اسلامی آبادی باقی رہے گی۔ پس جو لوگ ہندوستان میں

ہیں وہ جب تک ہندوستان میں رہیں شرعاً ان کے لیے جائز نہیں کہ اسلام کے فریق محارب سے کسی طرح کا علاقۂ محبت والفت یا اعانت وخدمت کا رکھیں۔ جو شخص رکھے گا وہ حسب نص قرآنی اسلام کے دشمنوں میں محسوب ہوگا۔ ومن یتولہم منکم فانہ منہم

"علاقۂ محبت وخدمت" میں نے "موالات" کا ترجمہ کیا ہے جو قرآن میں وارد ہے "موالات" میں تمام باتیں داخل ہیں جن سے خلافت کمیٹی "نن کواپریشن" کے نام سے روک رہی ہیں۔ آج ہی نہیں بلکہ اعلان جنگ ٹرکی کے وقت سے مسلمانوں کے لیے وہ تمام باتیں ازروئے شرع ممنوع ہو چکی ہیں گزشتہ فروری کے جلسہ دہلی سے لے کر ۱۱ اپریل کے جلسۂ خلافت کمیٹی بمبئی تک میں نے "نن کواپریشن" کو قبول کرانے کے لیے جس قدر کوشش کی حتیٰ کہ وہ منظور کر لیا گیا اِس کی بنا یہی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ اسلامی مطالبات کی عدم منظوری کے بعد بطور ایک دفاعی عمل کے اِس تجویز پر عمل کیا جائے۔ کیوں کہ شرعاً نہ تو یہ دفاع وجہاد ہے نہ کوئی مستقل عمل۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ دفاع کے اقدامات میں داخل ہے۔ مسلمانوں کو ترک موالات اول روز ہی سے کرنا تھا۔ نہ کیا تو یہ اشد شدید معصیت تھی اور نفاق قطعی۔ اب جب بھی کریں اور جس قدر بھی کریں عین مطلوب و مقصود۔ چناں چہ دہلی کی سب سے پہلے "نن کواپریشن" سب کمیٹی کے بعد ہی میں نے میرٹھ خلافت کانفرنس میں یہ تفصیل واضح کر دیا تھا کہ ہمارا مقصود اس سے

کیا ہے اور مسلمانوں کو یہ کام کیوں اور کس شکل میں انجام دینا چاہیئے۔

۷۔ یہ میری راہ ہے میری بصیرت ہے۔ میرا یقین اور ایمان ہے نہ کہ کوئی قیاس، رائے اور پولیٹیکل حکمت عملی۔ تمام یورپ اسلامی حکومت سے نکل چکا۔ بغداد و شام جا چکے۔ لیکن ایمان باقی ہے۔ اب ہم کو قسطنطنیہ کا بچاؤ کرنا ہے، بلکہ اپنے ایمان کا بچاؤ درپیش ہے اور مقصود بقائے ملک نہیں ہے بلکہ صرف بقائے ایمان۔

اگر قسطنطنیہ اور بغداد کو نہیں بچا سکتے تو کم از کم اپنا ایمان تو بچا لے جائیں۔ میں نے آخری فیصلہ کر لیا ہے اور پورے اطمینان و انشراح قلب کے ساتھ اس مسلک پر مستقیم ہوں۔ جس طالب حق کو مجھ پر اعتماد ہو اللہ کی راہ میں میرا ساتھ دے۔

۸۔ بالفعل طریق عمل یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ توفیق عمل دے وہ فوراً اپنے عزم سے مجھے مطلع کریں یا حسب ذیل اصحاب سے مل کر تفصیلی ہدایات حاصل کریں:

مولوی عبدالقادر صاحب وکیل (قصور، ضلع لاہور)

مولوی محی الدین احمد صاحب بی اے (قصور ضلع لاہور)

مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی (امرت سر)

پیر سید تراب علی شاہ صاحب راشدی لاڑکانہ (سندھ)

مولوی عبدالباقی صاحب ملیح آبادی ایڈیٹر "البیان" (لکھنو)

۹۔ رسالہ ہجرت زیر تحریر ہے عنقریب شائع ہوگا۔ جن حضرات کو دلائل شرعیہ کی نسبت تامل ہو وہ اس کا انتظار کریں۔

فقیر

احمد (ابوالکلام) کان اللہ لہ

کلکتہ ۱۔ ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ